سلسلۂ اشاعت امامیہ مشن لکھنؤ (نمبر ۷۲)

نظام زندگی



حضرت سید العلماء جناب مولانا سید علی نقی صاحب قبلہ دام ظلہ

(دار الواعظ صفدر پریس کیننگ اسٹریٹ لکھنؤ)

امامیہ مشن کی امداد کے طریقے

اوّل۔ جو حضرات سابق میں ممبری قبول فرما چکے ہیں اور درمیان میں کسی وجہ سے سلسلہ منقطع ہو گیا ہے وہ مکرر گزشتہ چندہ ادا فرما کر اپنی ممبری کو جاری رکھیں۔

دوئم۔ جن حضرات کو اب تک مشن کی ممبری کا موقع حاصل نہیں ہوا ہے وہ اپنی پہلی فہرست میں ممبری قبول فرما دیں اور انصار دین میں شامل ہوں

سوئم۔ مشن کے شایع کردہ رسالوں کو خرید فرما کر غیر اقوام میں مفت تقسیم کریں اور اپنے حلقہ اثر سے دیگر مومنین کو ممبر بنا کر مشن کے ممبران کی تعداد میں اضافہ فرمائیں تاکہ مشن کا حلقہ اثر اور بڑھے۔

چہارم۔ مشن کی بک ایجنسی کی کتابیں خرید فرما دیں اور لکھنؤ میں ملنے والی ہر علمی۔ ادبی۔ اخلاقی۔ دینی۔ کتاب مشن کے ذریعہ طلب فرما کر معین ہوں۔

پنجم۔ تاجران کتب مشن کے رسائل تجارتی نرخ سے نقد قیمت پر خرید فرما کر مختلف مقامات پر مشن کی ایجنسیاں قائم کریں اور اس ذریعہ سے مشن کے رسائل کی اشاعت میں حصہ لیں۔

ششم۔ مشن کے وہ رسائل جو واقعات کربلا سے تعلق رکھتے ہیں خرید فرما کر مجالس عزا نیز کی جگہ پر تقسیم فرمائیں جس سے مومنین کو غذائے روحانی حاصل ہو اور ہم ثواب کا مصداق قرار پائے۔

نظام زندگی

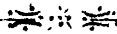
(حصہ اوّل)

(مصنفہ)

حضرت سید العلماء مولانا السید علی نقی النقوی دام ظلہ

(مطبوعہ الواعظ صفدر پریس کیننگ سٹریٹ لکھنؤ)

امامیہ مشن کی بہترین خدمت



"نظام زندگی" ایک اہم سلسلۂ تصنیف ہے جس کی پہلی کڑی اس وقت پیش کی جا رہی ہے۔

انسانی زندگی کا نظام مذہبی تعلیمات کے رو سے عقلی و نقلی تحقیقات کے ساتھ درج کیا گیا ہے اور اس ذیل میں کثیر التعداد مسائل تعلیم و تربیت، اجتماع و تمدن، تہذیب اخلاق اور فلسفۂ احکام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

امید ہے کہ افراد قوم اس حصہ کی اشاعت میں پورے انہماک سے کام لیں گے تاکہ اس سلسلہ کے دوسرے حصص بھی جلد شایع کیے جا سکیں۔

خادم قوم

سید مصطفے احسن رضوی

آنریری سکریٹری امامیہ مشن نخاس لکھنؤ

صفر سنہ ۱۳۵۹ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین و الصلوٰۃ علی سید الانبیاء والمرسلین
و آلہ الطاہرین -

تمہید

ایحسب الانسان ان یترک سدی

انسان کا یہ خیال غلط ہے کہ وہ دنیا میں یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا
"یوں ہی" یعنی بغیر کسی نظم و قاعدہ اور آئین و قانون کے۔
بے نظم و بے اصول تو چھوڑا اُس وقت جا سکتا تھا جب اُس کا خالق
ناسمجھ اور غیر ذی شعور ہوتا یا نظم و قانون کے عمل میں لانے سے عاجز ہوتا۔
دنیا کی ہر شے میں نظام قائم ہے اور یہ اُس نظام ہی کا نتیجہ ہے کہ
دنیا میں علوم و فنون کی بنیاد قائم ہوئی ہے۔ وہ چاہے طب ہو اور چاہے
سائنس علم النباتات ہو یا علم الحیوانات جو بھی اس طرح کا فن ہو اُس کی
حقیقت صرف نظام کائنات کے سمجھنے پر منحصر ہے۔
علوم کی بنیاد کلیات پر ہوتی ہے اور کلیات قائم ہی نہیں ہو سکتے جب تک

باضابطہ نظام موجود نہ ہو، اتفاقیات کا کوئی معیار نہیں ہوتا اس لیئے اُن
کے دیکھنے سے بطور کلیہ کوئی اصول قائم نہیں ہوسکتا۔

پھر جب ہر شے با اصول ہے اور نظام کے تحت میں ہے تو یہ انسان غیر منظم اور
بے اصول کیوں ہو۔

بس فرق اتنا ہے کہ اُن تمام چیزوں کا نظم و ارتباط خالق عالم نے بالکل
اپنی قوت اور ارادہ کے ماتحت رکھا ہے لیکن انسان کو "انسان" بنانا تھا
اور اُس کی انسانیت اپنی اختیاری طاقتوں کے عمل میں لانے سے وابستہ ہے
اس لیئے اس کے افعال و اعمال کے نظم و آئین کو اس کے ارادہ و اختیار
سے وابستہ قرار دیا اور اپنی جانب سے اُس نے اس بارے میں حکمرانی اور ہدایت
پر اکتفا کی یعنی تمام دوسری چیزون کا انتظام ادارہ "تکوین" سے متعلق
اور انسان کا انتظام ادارہ "تشریع" سے متعلق ہے۔

بیشک احکام شرعیہ کے تحت میں ہر طرح اس انسان کی عملی زندگی کے آراستہ
بنانے کا انتظام کیا گیا اور انسان کے ہر دور حیات سے متعلق اس طرح اہتمام کیا
گیا کہ یہ انسان صحیح طور پر ایک نظام و اصول اور آئین کا پابند ہو اس کے
لیئے اُس نے شرعی ہدایات کے ذریعہ سے ایک مکمل "نظام نامۂ زندگی" یا
"دستور العمل حیات" ہم تک پہونچا دیا جس کے پورے طور پر پابند ہونے ہی میں ہماری
اصلاح اور کامیابی مضمر ہے۔

نظامِ زندگی کی ابتدائی داغ بیل

اس کے انتظامات کب سے شروع ہوئے؟ اہل مذہب اس سلسلہ میں بڑی دُور کا پتہ دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ جب ہر انسان کی روح کا جسم سے تعلق بھی نہیں ہوا تھا اُس وقت روح کو سبق پڑھائے گئے اور اُس سے عہد و پیمان لیے گئے تھے۔ اُسے "عالم ذر" کے نام سے یاد کرتے ہیں اور قرآن میں اُس پیمان کا تذکرہ موجود ہے (الست بربکم قالو ابلیٰ) یقیناً مجھ کو اور میرے ایسے بہت سوں کو وہ عہد و پیمان یاد نہیں ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کسی انسان کو وہ یاد نہیں ہو سکتا۔ ایک خود فراموش کسی بات کو بھول جانے والا یہ حکم لگانے کا کیا حق رکھتا ہے کہ اُس کی طرح سب بھول جائیں گے ممکن ہے کہ بڑے قوی نفس اور ادراک والے ایسے انسان ہوں جن کی روح ان مادیات کے شکنجوں میں ظاہری طور پر گرفتار ہو کے بھی اُس عالم "الست" کو اور وہاں کے عہد و پیمان کو پوری طرح یاد رکھتی ہو مگر میں تو اپنے محدود اور کمزور نفس کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ مجھے وہ عہد یاد نہیں پھر بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ ایک چیز جو کسی وقت یاد کر لی گئی ہو ممکن ہے کہ بعد میں فراموش ہو جائے اور اُس کا یاد کیا جانا بھی دماغ میں محفوظ نہ ہو مگر پھر جب وہ سبق پڑھایا جائے گا اور یاد کرنے کی کوشش کی جائے گی تو اُس پہلی یاد کا مٹا ہوا نقش اس مرتبہ سہولت کا باعث ضرور ہوگا

اور اتنی دشواری اس میں نہ ہوگی جتنی بالکل کسی نئے سبق کے یاد کرنے میں ہوتی
اس طرح عالم "الست" کا ہونا ضرور انسانی نفوس کو ان کے موجودہ
دور میں معرفت و اطاعت کے درجہ سے قریب کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے
مگر یہ اعتقاد سے متعلق چیز ہے جو شخص اس جسم سے پہلے روح کے وجود ہی کا قائل
نہ ہو اور "عالم ذر" کو کوئی چیز نہ سمجھتا ہو وہ میرے اس بیان کو بالکل غلط اور
بے بنیاد سمجھے گا۔
پھر آیئے آگے بڑھیں اور اسی دور کا مطالعہ کریں کہ جب یہ انسان مادی حیثیت سے
عالم وجود میں آتا ہے یعنی دنیا میں پیدا ہوتا ہے۔
ہم دیکھتے ہیں کہ احکام شریعت نے اس کی پیدائش کے پہلے ہی سے اس
کی آیندہ عملی زندگی کی اصلاح کی طرف توجہ رکھی ہے۔

رابطۂ ازدواج میں مستقبل کا لحاظ

اولاد کے مفاد کیلئے ماں کا انتخاب

شریعت نے اس انسان کی زندگی کی اصلاح کا اس وقت سے انتظام
کیا ہے جس وقت کہ ابھی اس نے دنیا میں قدم نہیں رکھا ہے وہ ابھی کسی پردہ میں
پوشیدہ بھی نہیں ہے بلکہ اس کا آیندہ بھی موجود ہونا کوئی یقینی امر نہیں، صرف
ایک توقع بعید کی حیثیت رکھتا ہے یہ وہ وقت ہے جب کہ اس کا باپ شادی کرنے کا

ارادہ کرتا ہے۔ اُسی وقت اس طرح کے ہدایات ہیں کہ ہر عورت کے ساتھ آنکھیں بند کرکے وہ شادی نہ کرے بلکہ قوت انتخاب سے کام لے۔ ایسی عورتوں سے اور ایسے گھرانوں میں شادی کرے جو عادات و افعال کے لحاظ سے جوہر شرافت و انسانیت کے حامل ہوں۔ یہ اس لیے ہے کہ اُس عورت سے پیدا ہونے والی اولاد بُرے اوصاف وخصائل کی طرف رجحان نہ رکھتی ہو۔ اور بُرے اثرات کی حامل نہ ہو۔

یہ امر کسی طرح شک وشبہہ کی گنجائش نہیں رکھتا کہ بہت سے اوصاف وراثت کے ذریعہ سے اولاد کی طرف منتقل ہوتے ہیں وہ لوگ جو جانوروں کی ترتیب کا شوق وذوق رکھتے ہیں اس قسم کے تجربات حاصل کرتے رہتے ہوں گے کہ ایک ادنیٰ قسم کے جانور کا تعلق اعلیٰ قسم کے جانور سے پیدا کرکے کس طرح اُس کی نسل کو رفتہ رفتہ بلند درجہ پر لایا جاتا ہے۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اوصاف میں وراثت کا قانون جاری ہے پھر اخلاق وعادات۔ یہ اکثر مزاج طبعی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ بالکل غیر قابل تبدیلی نہ ہوں بلکہ قوت کے ساتھ اُن کا مقابلہ کرنے پر اُن میں تبدیلی ہوسکے لیکن پھر بھی طبیعت کا تقاضا کسی خاص طرح کے افعال کے لیے ایک ناقابل انکار حقیقت ہے اور جبکہ مزاج طبعی ماں باپ کا اولاد کی طرف منتقل ہوتا ہے تو خصائل وعادات کی یگانگت اُسی کا نتیجہ ہوسکتی ہے۔

اس بنا پر ضرورت ہے کہ باپ اور ماں افعال وکردار کے لحاظ سے بلند

اور پاکیزہ ہوں تا کہ اُن کے صفات کا عکس اولاد کے اوپر پڑ سکے۔ یہی وجہ ہے
کہ اس معاملہ میں شریعت نے پابندیاں عائد کرنا ضروری خیال کی ہیں۔

دنیا میں شادی بیاہ کے مسئلہ میں مختلف حیثیتوں سے تفریق قائم کی گئی ہے
کبھی اونچ ذات اور نیچ ذات دیکھی جاتی ہے۔ یہ بات ہندوستان کے مسلمانوں
میں بہت زیادہ پیدا ہوگئی ہے۔ ادھر کسی کا ذکر ہوا، کہا گیا وہ تو کم ہے۔ اُس
کی ذات خراب ہے وہ برابر والا نہیں ہے۔ اس تفریق کو مذہب اسلام نے بالکل
ناقابل اعتبار قرار دیا ہے۔

یہ یہود و نصاریٰ کی ذہنیت تھی کہ وہ بنی اسمٰعیل کو جن میں سے رسول اللہؐ
تھے اپنے سے کم درجہ پر سمجھتے تھے اُن کا خیال تھا کہ ہم بیوی کی اولاد ہیں اور یہ
لونڈی کی نسل سے ہیں ان کو ہمارے مقابلہ کا حق نہیں مگر شریعت اسلام نے
یہ عام اعلان کیا کہ نسلی تفریق کوئی چیز نہیں ہے انما جعلنا کم شعوبا و قبائل
لتعارفوا (یہ تو فقط شناخت کے لیئے خاندانوں کی تفریق قرار دی گئی ہے
اس سے عزت میں کوئی فرق نہیں آتا) اور حضرت رسول اللہؐ نے صاف اظہار
کر دیا کہ لا فخر للقرشی علی غیر القرشی ولا للعربی علی غیر العربی۔
"کوئی فخر نہیں قرشی کو غیر قرشی پر اور عربی کو غیر عربی پر"

قرآن میں ہے:۔ خلقنا کم من نفس واحدۃ۔ تم سب ایک ہی ہو
پھر تفریق کیسی؟ خود رسول اللہؐ نے اپنی بہت قریب کی عزیز زینب بنت جحش

کا عقد زید بن حارثہ کے ساتھ کر دیا جو بظاہر غلام کی حیثیت رکھتے تھے اور صنبیعہ بنت الحارث کا عقد مقداد کے ساتھ کر دیا۔

اسی طرح مال و دولت کے اعتبار سے تفرقہ جو عام طور سے قابل لحاظ سمجھا جاتا ہی۔ لطف یہ ہی کہ لڑکی والے اس امر کا لحاظ کریں تو پھر بھی صحیح ہی اس لیے کہ اُس لڑکی کی زندگی، اُس کا نان و نفقہ سب مرد کے ساتھ وابستہ ہی۔ لیکن آجکل تو لڑکے والے اس امر کو دریافت کرتے ہیں کہ لڑکی صاحب جائداد ہی یا نہیں اور وہ کتنے دولتمند گھرانے سے تعلق رکھتی ہی۔ یہ بہت افسوسناک ذہنیت ہے، بعض افراد حُسن و جمال کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ اب موجودہ زمانہ میں اخباروں میں شادیوں کے لیے جو اعلانات ہوتے ہیں اُن میں اکثر خوبصورتی کا تذکرہ موجود ہوتا ہے شرعی تعلیمات میں ان دونوں باتوں کے لحاظ کو بیجا قرار دیا گیا ہی اور یہ بتلایا گیا ہی کہ جو مال و جمال کو صرف اپنا مقصد قرار دیگا وہ ان دونوں باتوں سے محروم ہوگا۔

وہاں کس اعتبار سے تفریق قرار دی گئی ہی؟ عقائد و اعمال کے لحاظ سے۔ کافر اور مسلم کفو نہیں ہیں اُن کی شادی بالکل ناجائز۔ کیونکہ عقائد و اعمال کا اثر اولاد پر پڑنا ضروری ہے۔ اسی طرح بد سیرت اور غیر شریفانہ افعال کی مرتکب عورتوں کے ساتھ شادی کی ممانعت۔

قرآن مجید میں یہ حکم دیا جارہا ہی کہ الزانی لا ینکح الا زانیة

او مشرکۃ والزانیۃ لا ینکحہا الا زان او مشرک اس کا یہ مقصد ہے کہ برے افعال کے جراثیم اپنے مرکز سے متعدی ہو کر کسی صاف فضا کو بھی مکدر نہ بنا دیں

"ماں کا انتخاب" اولاد کے مفاد کی خاطر ہے اس کے لیئے ملاحظہ ہوں ذیل کی احادیث۔۔ امام جعفر صادقؑ کی روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا۔ اختاروا للنطفکم فان الخال احد الضجیعین یعنی اپنے نطفوں کے لیے محل کی تلاش میں انتخاب سے کام لو کیونکہ ننھیال کا بچہ پر برا اثر پڑتا ہے"۔

ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔

الشجاعۃ فی اھل خراسان والسخاء والحسد فی العرب فتخیروا نطفکم "خراسان کے لوگوں میں شجاعت کی صفت ہے اور عربوں میں سخاوت ہے اور حسد۔ لہذا اپنے نطفوں کے لیئے سمجھ بوجھ کر انتخاب کرو"

اس امر میں سب سے زیادہ لحاظ سیرت اور خصال و عادات ہی کا ہے امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں "انما المرأۃ قلادۃ فانظر الی ما تقلدہ" عورت گلے کا ہار ہے۔ ذرا غور کر لو کہ تم کیسی عورت کو گلے کا ہار بنا رہے ہو" ارشاد ہوتا ہے

لیس للمرأۃ خطر لا لصالحتھن ولا لطالحتھن اما صالحتھن فلیس خطرھا الذھب والفضۃ بل ھی خیر من الذھب والفضۃ واما طالحتھن فلیس التراب خطرھا بل التراب خیر منھا۔

"عورت کی کوئی قیمت نہیں یعنی کوئی شے نہیں جو اس کے مساوی ہو سکے

نہ نیکوکار عورت کے لیۓ اور نہ بدکار کے لیۓ - اگر نیکوکار عورت ہی تو سونا چاندی بھی اسکے مقابل نہین آسکتے بلکہ وہ سونے اور چاندی سے بہتر ہے اور اگر بدکار ہے تو مٹی بھی اُس کے مقابل نہین کیونکہ مٹی بھی اُس سے بہتر ہے "

صورت کا حسن وجمال سیرت کی خرابی کے ساتھ کوئی چیز نہیں اس کو ان الفاظ مین ادا فرمایا ہے کہ :- ایھا الناس ہایاکم وخضرء الدمن -

" خبردار اُن باغون سے بچتے رہو جو گھورے پر اُگے ہوئے ہون " پوچھا گیا کہ اس کا مطلب ؟ فرمایا - المرأۃ الحسناء فی منبت السوء

" خوبصورت عورت برے سیرت وکردار کے ساتھ "

یہ ہی شریعت کی وہ پیش بندی جو نسل انسانی کے آراستہ بنانے کیلئے پہلے سے کی گئی ہے -

آداب نکاح مین انسانی ذہنیت کی تشکیل

شادی بیاہ عام طور پر انسانی نفس کے تقاضا کا نتیجہ ہے مگر یہ اسلام کی حکیمانہ روش ہی کہ اُس نے شادی کے مسئلہ مین اس قدر حدود و قیود اور آداب و قواعد عائد کردیے ہیں جن کے بعد وہ ایک فرض اور شرعی رسم کی صورت سے عمل مین آتا ہی - اس میں بڑا رمز یہ ہے کہ جو چیز صرف جذبات کے تحت مین عمل میں لائی جاۓ اُس کے نتائج کی اصلاح پر انسان کو توجہ

کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں محسوس ہوتی اور اُس کا صرف خواہش نفس کی بنا پر عمل میں آنا خود ہی اُس کے مطلق العنان ہو جانے کا محرک ہے مگر جبکہ وہ امر فرض وقانون کی بنا پر عمل میں آئے گا تو انسان کو اس کے نتائج کی طرف توجہ بھی پیدا ہوگی اور ان کی اصلاح کی فکر ہوگی۔

شادی کے وقت سے اولاد کے مفاد کو کس حد تک پیش نظر رکھا گیا ہے اس کو آپ ان دعاؤں سے سمجھ سکتے ہیں جن کے پڑھنے کی اس موقع پر ہدایت ہوئی ہے۔ یہ دعائیں جو استحبابی طور پر وارد ہوئی ہیں ظاہر میں بالکل معمولی چیز سمجھی جاتی ہیں مگر ان دعاؤں ہی میں وہ روح مضمر ہوتی ہے جو کسی عمل کی اصل بنیاد ہے یا اُن میں اُس مفاد و منشا کی جانب اشارہ ہوتا ہے جو اُس عمل میں مضمر ہے۔ اُن سے انسانی دماغ میں وہ خیالات راسخ کیے جاتے ہیں جن کا پیش نظر رکھا جانا شارع کو مدنظر ہے۔

اب دیکھیے امام جعفر صادقؑ نے ابو بصیر کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا۔ اذا تزوّج احدکم کیف یصنع "جب تم میں سے کسی کی شادی ہوتی ہے تو اُسے کیا کرنا چاہیے؟" ابو بصیر نے عرض کیا ما ادری جعلت فداک "مجھے نہیں معلوم فدایت شوم"، حضرت نے فرمایا جب شادی کا ارادہ ہو تو دو رکعت نماز پڑھے اور حمد خدا بجا لائے اور کہے اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اُرِیْدُ اَنْ اَتَزَوَّجَ اَللّٰهُمَّ فَاقْدِرْ لِیْ مِنَ النِّسَاۗءِ اَعَفَّهُنَّ فَرْجًا وَّاَحْفَظَهُنَّ لِیْ فِیْ

نَفْسِهَا وَفِيْ مَالِيْ وَاَوْسَعَهُنَّ رِزْقًا وَاَعْظَمَهُنَّ بَرَكَةً وَاقْدِرْ لِيْ مِنْهَا وَلَدًا طَيِّبًا تَجْعَلُهُ خَلَفًا صَالِحًا فِيْ حَيٰوتِيْ وَبَعْدَ مَوْتِيْ۔

(یعنی) "خداوندا میں چاہتا ہوں کہ شادی کروں۔ بار الہا تو مقرر کر میرے لیے عورتوں میں وہ جو سب سے زیادہ پارسا ہو اور اپنی ذات اور میرے مال و دولت کے بارے میں میری امانت کی حفاظت کرنے والی ہو اور اچھی قسمت والی اور مبارک ہو اور مقرر کر میرے واسطے اس سے ایک پاکیزہ فرزند جو صالح اور نیک عمل ہو اور میرا جانشین ہو میری زندگی میں بھی اور میرے مرنے کے بعد بھی۔"

پھر جب شادی ہو جائے اور عورت کو بیاہ کر گھر میں لائے تو اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھے اور یہ دعا پڑھے۔ اَللّٰهُمَّ عَلٰى كِتَابِكَ تَزَوَّجْتُهَا وَفِيْ اَمَانَتِكَ اَخَذْتُهَا وَبِكَلِمَاتِكَ اسْتَحْلَلْتُ فَرْجَهَا فَاِنْ قَضَيْتَ فِيْ رَحِمِهَا شَيْئًا فَاجْعَلْهُ مُسْلِمًا سَوِيًّا وَلَا تَجْعَلْهُ شِرْكَ شَيْطَانٍ۔

(یعنی) خداوندا تیری کتاب کے مطابق میں نے اس سے شادی کی ہے اور تیری ذمہ داری پر میں نے اس کو لیا ہے اور تیرے مقرر کردہ الفاظ کے ذریعہ سے میں نے اس کو اپنے لیے جائز بنایا ہے اب اگر تو نے اس کے بطن سے کوئی اولاد میرے مقدر میں قرار دی ہے تو اسے بالکل صحیح مسلمان بنانا اور اس میں شیطان کو شرکت کا موقع نہ دینا۔"

"سویا" کے لفظ کے معنی ہیں "تام و کامل" اس کا جیسا مفہوم آئے تنا ہیت مکمل دکھایا

اُس لحاظ سے معتبر ہوگا "ذکرا سویا" اس کے معنی ہوں گے تام الخلقت لڑکا اور میاں حیوٰۃ مسئلہ ا سویا ہے اس لیے معنی یہ ہوں گے کہ "پورا مسلمان" جس سے اشارہ اعتقاد و عمل دونوں کے صحت و کمال کی طرف ہوگا۔ پھر کہا گیا کہ اس میں شیطان کی شرکت نہ ہو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ شیطانی رستوں کا سالک نہ ہو جیسی برائیوں کا ارتکاب کرنے والا نہ ہو جن کی تحریک شیطانی طاقتوں کا نتیجہ ہے۔

ان دعاؤں کے پڑھنے سے انسانی ذہنیت کی تشکیل ہوتی ہے اور یہ مقصد واضح ہوتا ہے کہ آئندہ ہونے والی اولاد کو کس طرح کا ہونا چاہیئے۔

وقت ولادت کے احکام

اب وہ وقت آیا کہ جب بچہ کی ولادت ہوئی اس وقت شریعت کی ہدایت ہے کہ داہنے کان میں اذان کہی جائے اور بائیں کان میں اقامت۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ سب سے پہلے اُس کو پیغام پہونچایا جائے وحدانیت خدا رسالت اور فرائض کی بجا آوری کا۔ ممکن ہے ہم کہیں کہ اس سے فائدہ کیا جبکہ وہ ہم کو یاد نہیں رہتا۔ اس کے متعلق میں عالم ذر کی بحث میں کہہ چکا ہوں کہ تعلیمات یاد نہیں تو یہ ضروری نہیں کہ کسی کو بھی یاد نہ رہے، پھر بچپنے کے واقعات کی یادداشت کے درجے تو مشاہدہ و تجربہ کے لحاظ سے بھی مختلف ہیں یعنی بہت سے

لوگوں کو تین چار برس کی باتیں یاد رہتی ہیں اور بعض کو اس سے کم سنی کی، پھر جبکہ اس کا کوئی عقلی معیار نہیں اور اختلاف درجات اس میں محسوس طریقہ سے ظاہر ہی تو ہمیں یہ سمجھنے کا کیا حق ہی کہ کسی کو اپنی پیدائش کے بعد کی باتیں یاد نہیں رہ سکتیں۔

پھر اسے یوں کیوں نہ سمجھ لیجئے کہ جیسے اہل دنیا نے اپنے مذاق کے مطابق شگون مقرر کیے ہیں جن سے اُن کی آرزو کا اظہار ہوتا ہی کہ مستقبل کے حالات اس طرح ہوں شریعت نے اُن کی ذہنیت کو بدلنے کے لیئے اپنی جانب سے یہ ایک شگون مقرر کیا ہے جس سے اس آرزو کا انسانی ذہن میں پیدا کرنا مقصود ہی کہ یہ بچہ آگے بڑھ کر اس راستے پر قائم رہے گا اور ان فرائض کی پابندی کریگا

رضاعت کا انتظام

بچہ کی غذا قدرت نے دودھ مقرر کی ہی اس کے لیئے اکثر ضرورت پڑتی ہی کہ اناؤں کے ذریعہ سے دودھ پلوایا جائے اور کبھی بلا ضرورت بھی رئیس خاندانوں کی عورتیں خود اس امر سے احتراز کرتی ہیں اور انا ملازم رکھتی ہیں اس امر میں شریعت کی جانب سے پہلے تو یہ تاکید ہی کہ ماں خود رضاعت کرے اور انا مقرر ہی نہ کی جائے۔ چنانچہ امیرالمومنین ارشاد فرماتے ہیں ما من لبن رضع بہ الصبی اعظم برکۃ علیہ من لبن امّہ کوئی دودھ جس سے

بچہ کی رضاعت ہو اُس کے لیے ماں کے دودھ سے زیادہ مبارک نہیں ہے
اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے کہ غذا جس قدر مناسب مزاج ہوگی اُسی قدر
اُس کا فائدہ زیادہ ظاہر ہوگا اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ بچہ جو مثل اپنی ماں
کے ایک جزو ہی اُس کے لیے خود اُسی ماں کے دودھ سے زیادہ کوئی چیز مناسب
مزاج نہیں ہو سکتی۔

لیکن اگر ضرورت ہو انا مقرر کرنے کی یا بلا ضرورت بھی ماں اپنے فرض کو
انجام نہ دے اور انا مقرر کرے تو تاکید ہے کہ انا کے بارے میں انتخاب سے
کام لیا جائے۔ ہر ایک کا دودھ اس بچہ کو نہ دیا جائے اس لیے کہ اُس کا اثر
اس بچے کے اوصاف و افعال پر پڑے گا اور وہی خو بو اس میں قائم رہے گی۔

چنانچہ تاکید ہے کہ یہودیہ، نصرانیہ، اور مجوسیہ سے دودھ نہ پلوایا جائے۔ اگر
اتفاق سے یہ امر ناگزیر ہو تو بچے کو اُسے دیا نہ جائے کہ وہ اپنے گھر لے جائے بلکہ
اُس کو بلا کر اپنے یہاں رکھا جائے اور خمر و خنزیر کے استعمال سے اُس کو روک دیا
جائے مقصود یہ ہے کہ اگر وہ ان چیزوں کا استعمال کرے گی تو ان سے خود اُس کا
خون تیار ہوگا اور وہ دودھ کی شکل میں آئے گا اور وہ اس بچہ کے جسم میں جاکر
اس کے خون کی صورت اختیار کرے گا۔ شریعت کو کسی صورت سے بھی یہ منظور نہیں
کہ مسلمان کے جسم میں ان چیزوں کی شرکت پیدا ہو۔

ناصبی عورت سے بھی رضاعت کی ممانعت ہے وہ وہ ہے جو عداوت اہلبیتؑ کا

اظہار کرتی ہو۔ اس کے علاوہ اُس کے دوسرے اوصاف کا بھی لحاظ کرنا ضروری ہے تاکہ بچہ کے اوصاف پر کوئی بُرا اثر نہ پڑے۔

امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں۔ انظروا من یرضع اولادکم فان الولد یشب علیہ "ذرا دیکھ بھال لو کہ تمھاری اولاد کی رضاعت کس طرح کی عورت کر رہی ہے۔ اس لیئے کہ ان ہی آثار پر جو دودھ سے پیدا ہوں لڑکا جوان ہوگا"

امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں:۔ لا تسترضعوا الحمقاء فان اللبن یعدی وان الغلام ینزع الی اللبن "کم عقل عورت سے دودھ نہ پلواؤ اس لیئے کہ "دُودھ تعدی کا باعث ہوتا ہے اور بچہ دودھ کے خواص کی طرف کھنچ جاتا ہے"

امیرالمومنینؑ کا ارشاد ہے "تخیروا للرضاع کما تتخیرون للنکاح فان الرضاع یغیر الطباع۔ " رضاعت کے لیئے اُسی طرح انتخاب سے کام لو جیسے شادی کے لیئے انتخاب کرتے ہو اس لیئے کہ رضاعت کا اثر طبعی خواص پر غالب آجاتا ہے اور طبیعت میں تبدیلی کر دیتا ہے"

دُودھ بڑھائی کے بعد

جب دو برس بچہ کی عمر کے پورے ہو جائیں تو یہ شرعاً دُودھ پینے کی آخری مدت ہے۔ خود قرآن مجید میں مذکور ہے والوالدات یرضعن اولادھن حولین کاملین اس آیت سے وہ امر بھی ظاہر ہے جس پر میں نے پہلے

تبصرہ کیا تھا کہ مطلوب اولین شرع کا یہی ہے کہ خود ماں اپنے بچہ کو دُودھ پلائے کیونکہ ارشاد ہوتا ہے کہ "مائیں اپنی اولاد کو دودھ پلائیں پورے دو برس" اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر دو برس کے بعد کوئی عورت بچہ کو دودھ پلائے تو وہ احکام جو شرعاً رضاع کے لیئے مقرر ہیں مترتب نہ ہوں گے۔ نہ وہ اس کی ماں قرار پائے گی۔ نہ اُس کی اولاد اس کی بھائی بہن وغیرہ۔ اس حکم میں کوئی خصوصیت لڑکے لڑکی کی نہیں ہے۔ "اولادھن" کی لفظ دونوں کو عام ہے۔

اب اس کے بعد چار یا پنچ برس بچہ کو کھیل کود لینے دینا چاہیئے یہ زمانہ تعلیم و تربیت اخلاق کا نہیں ہے اس لیئے کہ ابھی وہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکتا بیشک اس دوران میں بھی ایک حدتک نگرانی ضروری ہے اُن چیزوں کے متعلق جن کی اہمیت بہت زیادہ ہے مثلاً شراب وغیرہ کا استعمال نہ ہونے دے نیز کسی دوسرے کی نقصان رسانی کا باعث نہ ہو مگر یہ چیز تربیت و تعلیم کی حیثیت سے نہیں ہے۔ بلکہ یہ ویسا ہے۔ جیسے جانور اپنا ہو تو اُس کے ذریعہ سے کسی کو نقصان پہونچنے نہ دینا چاہیئے اور شراب وغیرہ سے روکنا اُس طرح جیسے زہر سنکھیا کے استعمال سے اس بچہ کو روکنا تاکہ اس میں مضر جراثیم اور مہلک سمیت پیدا نہ ہو جائے۔ یہ ایک باپ یا سرپرست کا ذاتی فرض ہے بچّہ کی تعلیم سے اس کو تعلق نہیں ہے۔

تربیت کا زمانہ

(اور)

ماں باپ کی ذمہ داریاں

جس وقت سے کہ بچہ سات یا چھ برس کا ہو اب اُس کی تعلیم و تربیت کی ضرورت ہے۔

یہ بالکل غلط خیال ہے کہ ایک انسان صرف اپنے اعمال کا جواب دہ ہے بلکہ اپنی اولاد کی اصلاح و تربیت اُس کا اہم فرض ہے۔

بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ وہ خود اپنی ذات سے بہت اچھے ہیں پابند صوم صلوٰۃ ہیں اور تمام احکام شرعیہ پر عامل ہیں مگر اپنی اولاد کی طرف اُنھوں نے کوئی توجہ نہیں کی ہے۔

ایسے لوگ یقیناً پیش خدا جواب دہ ہیں بلکہ مجھے خود اُن کے حُسن عمل میں تامل ہے۔ کیونکہ ان کی ظاہری پابندی شرع احکام شرع کی اہمیت کے احساس کی بنا پر نہیں ہے۔ اگر انھیں فرائض شرعیہ کی اہمیت کا صحیح احساس ہوتا تو کبھی وہ اپنی اولاد کو اس طرح مطلق العنان نہ چھوڑ دیتے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ انھیں بچہ کی معمولی معمولی باتوں کا جو اس زندگی سے متعلق ہیں خیال ہے۔ کسی وقت دوپہر کو گرمی میں اور لو کی شدت میں بچہ باہر نکلنا چاہتا ہے

ماں باپ ڈانٹ دینگے، روکیں گے اور زبردستی سے کام لیں گے کہ وہ باہر نہ جائے۔ کس لیے؟ اس واسطے کہ لوہ کی گرمی اُس کو تکلیف نہ پہونچائے پھر اس لوہ کی گرمی کا اتنا خیال مگر آخرت کے عذاب کی کوئی پرواہ نہین آتش جہنم کے بھڑکتے ہوئے شعلون کا کوئی خیال نہین وہ آزادی کے ساتھ اپنی اولاد کو ایسے راستون پر چلنے دیتے ہیں جو اُنھین غضب خداوندی کا مستحق بنائین معلوم ہوتا ہی کہ اُنھین صحیح احساس روز قیامت کے حساب اور احکام خدا کی اطاعت کا نہین ہی۔ پھر یہ خود جو شرع کے پابند نظر آتے ہیں اس کو صرف ان کے والدین کے احساس فرض کا نتیجہ سمجھیے کہ اُنھون نے ان کو عادی بنا دیا ہی ان احکام کے بجالانے کا۔ اِس لیے یہ اُس کی پابندی کرتے ہین ورنہ خود ان کے دماغ میں کوئی خاص اہمیت ان احکام کی موجود نہین ہے۔

اس سے زیادہ قابل اعتراض ہے اُن اشخاص کا طرز عمل جو اپنے افعال و اعمال سے اپنے بچون کے لیے غلط مثال قائم کرتے ہیں اور برائیون کے لیے اُن کی ہمت افزائی کا باعث ہوتے ہین۔ میں سچ کہتا ہون کہ ان کے لیے تنہائی مین کسی جرم کا ارتکاب کر لینا اُتنا بُرا نہین ہی جتنا اپنی اولاد کے علم و اطلاع مین اس قسم کے افعال کا مرتکب ہونا۔ اگر جوانی کے دور میں کسی سے بے راہ روی ہوئی ہو تو پھر اُس پر خدا سے مغفرت کا متوقع رہے مگر اب اولاد کی موجودگی

میں بہت زیادہ اُسے اپنے نفس کی نگرانی کی ضرورت ہے یاد رہے کہ اگر اولاد کی تباہی اس کے ہاتھوں ہوئی اور اس کی نسل خود اس کے سبب سے گمراہی میں مبتلا ہوئی تو وہ خود دنیا سے اُٹھ جائیگا جب بھی اُس کے نامۂ عمل میں گناہوں کا سلسلہ قائم رہے گا کیونکہ وہ ذمہ دار ہے ان تمام خراب نتائج کا جو اس کے بعد رونما ہو رہے ہیں۔

اب ملاحظہ کیجئے کہ تربیت اولاد کے لیے شرع نے کس طرح انتظام کیا ہے۔

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں " دع ابنک یلعب سبع سنین والزم نفسک سبع سنین۔" سات برس تک بچہ کو کھیلنے دو، اور پھر سات برس اُسے بالکل اپنا پابند بنائے رکھو یعنی اُس کے افعال و اعمال کی سختی کے ساتھ نگرانی کرو" دوسری حدیث میں ہے۔

امھل صبیک حتی یاتی لہ ست سنین ثم ضمہ الیک سبع سنین " اپنے بچہ کو مہلت دو یہاں تک کہ اُس کی چھ برس کی عمر ہو۔ پھر سات برس تک اُسے بالکل اپنے ساتھ رکھو" یہ مدت کا اختلاف اس بنا پر ہے کہ حقیقتہً اس کے لیئے کوئی تعبدی حیثیت سے عمر نہیں مقرر کی گئی ہے بلکہ غالبی حیثیت سے عمر کا ایک تخمینہ بتلا یا گیا ہے، مطلب یہ ہے کہ جب بچہ کچھ سمجھدار ہو جائے اور تعلیم و تربیت کا اُس پر اثر پڑ سکے۔ یہ بات بعض بچوں میں پانچ یا چھ برس ہی میں حاصل ہو جائے گی اور بعض کے یہاں سات برس یا اس سے زیادہ میں

ابتدائی تعلیم

اس مدت میں ایک طرف تو بچہ کے اخلاق و افعال کو درست کرنا چاہیئے دوسری طرف اس کو احکام شرعیہ اور فرائض سے واقف بنانا چاہیئے اس لیئے کہ اس کے بعد عنقریب وہ وقت آجائے گا جب اس پر حکم تکلیف جاری ہوجائے اور وہ فرائض کی ذمہ داری میں گرفتار ہوجائے۔ اس کے لیئے اسے پہلے سے تیار رہنے کی ضرورت ہے۔

لیکن اس کے ساتھ شریعت نے ضروریات دنیا کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے امیر المومنین کی روایت ہے کہ رسالتمآبؐ نے فرمایا علّموا اولادکم السّباحة والرماية "اپنی اولاد کو پیراکی اور تیر اندازی کی تعلیم دو"

یہ وہ چیزیں جو دنیاوی زندگی کی حفاظت کا ذریعہ ہیں۔ یہاں ان دونوں چیزوں کا تذکرہ بطور مثال ہے "تیر اندازی" کے بجائے اگر کسی وقت میں کوئی دوسری صورت اس کی قائم مقام ہوجائے تو اس کی تعلیم کی ہدایت ہوگی اسی طرح پیرنے کی طرح اگر کشتی کا رواج ہوجائے تو کشتی رانی بھی اس میں داخل ہوسکتی ہے۔ یہ چیزیں حیات دنیا کے لیئے ہیں اور اسلام دنیاوی زندگی کی تقویت کا حامی ہے۔ یہ غلط ذہنیت ہے کہ ان تمام چیزوں کو عیب سمجھ لیا گیا ہے۔ یا ورع و تقویٰ کے منافی قرار دے لیا گیا ہے۔

بچہ جب اس سات برس میں اخلاق و عادات حسنہ کا پابند ہو گیا اور ایسی تعلیم بھی اس کو دے دی گئی جو اُس کے معاش و معاد دونوں کی اصلاح کے لیے ضروری ہے تو اب وہ وقت ہے کہ عملی طور پر اُس کو مشکلات دنیا کا حل کرنا سکھلایا جائے۔ اب باپ اُس کو بحیثیت ایک معین زندگی اور مددگار کے اپنے مستحسن کاموں میں اور مشکلات کے حل کرنے میں شریک کرے اور اُس کے قوائے عمل کی تکمیل کرے۔

اس کو امیر المومنین ان الفاظ میں فرماتے ہیں کہ:۔ یرفہ الصبی سبعا ویؤدب سبعا ویستخدم سبعا " سات برس تک بچہ کو آرام دینا چاہیے پھر سات برس تک اُسکے اخلاق و عادات کی اصلاح کرنا چاہیے پھر سات برس تک اُس سے کام لینا چاہیے"

اس کو رسالتمآب نے بہت زیادہ بلیغ الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے:۔

قال النبی الولد سید سبع سنین و عبد سبع سنین و وزیر سبع سنین " بچہ سات برس تک بادشاہ ہے یعنی جو چاہے کرے کوئی روک ٹوک نہیں۔ پھر سات برس غلام ہے اس لیے کہ ابھی اس میں عقل و شعور اتنا نہیں کہ وہ اچھائی برائی سمجھ سکے مگر بادل ناخواستہ صرف باپ کے دباؤ سے وہ اُس کے بتلائے ہوئے افعال کو کرے گا۔ یہ اُس طرح کی جبری اطاعت ہے جیسے غلام اپنے آقا کی کرتے ہیں پھر اس کے بعد سات برس یعنی پندرہ سے اکیس تک وہ وزیر ہے یعنی اُس میں اب خود عقل آ گئی اب وہ خود سمجھ کر باپ کا دست و بازو بن کر

زندگی کی منزلوں کو طے کریگا۔ یہ وہ شان ہے جو ایک وزیر کی بادشاہ کے لیے ہوتی ہے۔

غلط تربیت کے افسوسناک نتائج

مضر جراثیم سے حفاظت کی ضرورت

بچوں کو ابتدائی زندگی سے مہلک جراثیم سے محفوظ رکھنا انتہائی اہم فرض ہے موجودہ زمانہ میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ ادھر بچہ ذرا سن شعور کو پہونچا اور اُسے بغیر دینیات کی تعلیم دلائے ہوئے اسکول یا کالج میں بھیج دیا وہاں کے معلمین جو اپنے دماغوں میں مذہب کے خلاف خیالات لیے ہوئے ہوتے ہیں بچوں پر شروع ہی سے اپنا اثر ڈالتے ہیں۔ ممکن ہے کہ آئینی قواعد کی بنا پر وہ کھلم کھلا اپنے خیالات کی تبلیغ کا مدرسہ کے اندر حق نہ پائیں مگر اُن کے قلبی جذبات اور دماغی خیالات کا اثر اُن کے اقوال و افعال میں پیدا ہو جانا ضروری ہے۔ کسی مذہبی حکم کو سُننے پر خندۂ زیر لب، کسی مذہبی اعتقاد کے تذکرہ میں یہ الفاظ کہ "لوگ ایسا خیال کرتے ہیں" یہ وہ معمولی باتیں ہیں جو نہ معلوم کتنے طلاب کے ذہن کو متاثر بنا دیتی ہیں۔ ہر طالب علم اپنے ابتدائی دور میں تقریباً اپنے معلمین کو معصوم سمجھتا ہے۔ وہ اُن کی ہر بات کو سر آنکھوں پر رکھنے کے لیے آمادہ ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُس کے

دماغ میں مذہب کے خلاف خیالات راسخ ہو جاتے ہیں اور وہ سمجھتا ہے کہ یہ تمام معتقدات و روایات خرافات و اوہام کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ اب اگر آپ اس کی مذہبی اصلاح کرنا بھی چاہیں تو نہیں ہو گی اس لیے کہ وہ سننے پر آمادہ ہی نہ ہو گا اور سُنے گا تو اس خیال کو لے کر کہ یہ بالکل مہمل باتیں ہیں اس لیے اُس پر اثر نہیں ہو گا۔ یاد رکھنا چاہیے کہ انگریزی تعلیم پیدا سبب گمراہی کا نہیں ہے بلکہ یہ غلط طرز عمل گمراہی کا سبب ہے۔

اگر مذہب کی بنیادیں مضبوط ہو گئی ہوتیں تو بڑے بڑے شبہات و اعتراضات کو وہ برداشت کر لیتیں مگر یہاں بنیو مذہب کی بالکل مستحکم نہیں ہے اس لیے کہ یا تو مذہبی معلومات ہیں ہی نہیں یا ہیں تو صرف تقلیدی حیثیت سے اس لیے معمولی سا اعتراض و ایراد جو کسی حلقہ سے گوش زد ہو جاتا ہے اس کے اعتقاد کو متزلزل کر دیتا ہے۔

معصومینؑ کے کلمات میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔ اگرچہ اُس زمانہ میں مغربی تعلیم نہیں تھی۔ انگریزی مدارس موجود نہیں تھے مگر دوسرے گمراہ کن حلقے ایسے تھے جن کے لحاظ سے یہ تاکید کی گئی ہے کہ تم اپنے تعلیمات بچوں کے ذہن میں راسخ کر دو کہیں ایسا نہ ہو کہ دوسرے اثرات اُن پر پہلے پڑ جائیں پھر اُن میں قبول حق کی صلاحیت نہ باقی رہے۔

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:۔ بادروا احداثکم بالحدیث قبل ان

یسبقکم الیھم المرجئۃ " اپنے بچوں کو اپنے روایات و معتقدات کی تعلیم دینے میں جلدی کرو قبل اس کے کہ مرجئہ فرقہ کے تعلیمات اُن کی طرف سبقت کریں "

جناب امیرؑ کا ارشاد ہے :- علموا صبیانکم من علمنا ما ینفعھم اللہ بہ لا تغلب علیھم المرجئۃ برأیھا " اپنے بچوں کو تعلیم دو ہمارے علم سے وہ جس سے انکو فائدہ پہونچے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مرجئہ کے خیالات اُن پر غالب ہو جائیں "

امیرالمومنینؑ نے اپنے فرزند امام حسنؑ کے لیے جو وصیت نامہ تحریر فرمایا ہے جو تمام زندگی کے شعبوں کے لیے ہدایات کا ایک مکمل مجموعہ ہے اُس کی تمہید میں حضرت نے ہمیں ایک دائمی درس دیتے ہوئے یہ ارشاد کیا ہے جس سے ظاہر میں مخاطب امام حسنؑ ہیں مگر حقیقتہً اس میں ایک عمومی تعلیم مدنظر ہے۔ فرماتے ہیں فبادرتک بوصیتی لخصال ۔ " میں نے تمھیں اس وصیت کے پہونچانے میں جلدی سے کام لیا۔ چند وجہوں سے منھا ان تعجل بی اجلی " پہلے تو یہ کہ کہیں میری زندگی کی مدت نہ ختم ہو جائے " موت کا کوئی ٹھیک نہیں ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں :- وان یسبقنی الیک بعض غلبۃ الھوی وفتن الدنیا فتکون کالصعب النفور وانما قلب الحدث کالارض الخالیۃ ما القی فیھا من شئی قبلتہ فبادرتک بالادب قبل ان یقسو قلبک ویشتغل لبک ۔ " اور یہ کہ کہیں تم پر پہلے ہی کچھ غلط خیالات اور دنیا کے ہنگامی اثرات کا غلبہ نہ ہو جائے جس سے تم ایک سخت اور بھڑکنے والے مرکب کی طرح

بن جاؤ۔ کمسن بچہ کا دل مثل خالی زمین کے ہے کہ جو چیز اُس میں بوئی جائے
اُس کو وہ قبول کر لیتا ہے۔ لہٰذا میں نے چاہا کہ تمھیں تعلیم دیدوں قبل
اس کے کہ تمھارا دل سخت ہو اور تمھاری عقل دوسری چیزوں سے متاثر ہو۔
بے شک ایسے باپ، چچا یا دوسرے بزرگ انتہائی درجہ مورد اعتراض
ہیں جو اپنے سے متعلق بچوں کو اجنبی آغوش میں اور سمیت آمیز ہوا میں بغیر
کسی حفاظت کے بھیج دیتے ہیں یہ لوگ بعد میں خود پشیمان ہوں گے۔ جب
وہ دیکھیں گے کہ ان بچوں کے دل میں بڑے ہونے کے بعد اُن کا کوئی احترام
نہیں رہا، وہ اُنھیں بیوقوف سمجھنے لگے اور اُن پر مضحکہ کرنے لگے یہ باتیں
کبھی نہ ہوتیں اگر وہ پہلے ہی اُن کو صحیح تعلیمات سے روشناس کر دیتے
بہت ممکن ہے کہ یہ لڑکے بھی جب کبھی اُن کے قوائے عقلیہ بیدار ہوں اور آنکھیں
کھلیں تو ان بزرگوں کو دل ہی دل میں نفرین کریں کہ انھوں نے ہمارے
ساتھ صحیح طریقہ اختیار نہیں کیا۔

حدیث میں ہے :۔ قال رسول اللہؐ یلزم الوالدین من العقوق
لولدھما ما یلزم الولد لھما من عقوقھما " رسالتمآبؐ نے فرمایا کہ والدین
اپنی اولاد کے حقوق کے لحاظ سے اسی طرح عاق ہوتے ہیں جس طرح اولاد
اپنے والدین کے حقوق ادا نہ کرنے میں "

بات یہ ہے کہ "عاق" کے معنی تو نافرمان کے ہیں۔ باپ کی اطاعت

خدانے اولاد پر واجب کی ہے اس لیے اگر وہ اُن کی اطاعت نہ کرے تو نافرمان ہے۔ یہ جو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ فلاں باپ نے اپنی اولاد کو عاق کردیا اس کے کوئی معنی نہیں ہیں اگر وہ نافرمان ہے تو عاق ہے۔ چاہے یہ باپ کہے کہ میں نے عاق کردیا اور اگر وہ اطاعت گزار ہے تو باپ لاکھ کسی کے کہنے سُننے سے اُس کو عاق کرنا چاہے وہ عاق نہیں ہوگا۔ پھر اسی طرح خدانے جو حقوق اولاد کی تعلیم و تربیت کے باپ پر عائد کیے ہیں اگر وہ اُن کو ادا نہ کرے تو وہ بھی نافرمان ہے اس لیے "عاق" کے مفہوم میں داخل ہے

تربیت کے صحیح و مناسب اصول

اولاد کی تربیت بڑی دشوار اور نازک چیز ہے۔ معمولی معمولی بداخلاقیاں اولاد کے مزاج اخلاقی کے خراب ہونے کا باعث ہوسکتی ہیں امام موسیٰ کاظمؑ فرماتے ہیں۔ اذا وعدتم الصبیان ففوا لھم۔

"جب بچوں سے کوئی وعدہ کرو تو اُسے پورا کرو۔"

اگر والدین نے وعدہ خلافیاں کیں تو بچوں کے دماغ پر یہ اثر پڑ سکتا ہے کہ جھوٹ بولنا یا وعدہ خلافی کرنا کوئی بُرا کام نہیں ہے۔ اس لیے وہ اپنی آئندہ زندگی میں اس جرم کی کوئی اہمیت نہیں سمجھیں گے۔

بے شک باپ کی تعلیم و تربیت اپنی اولاد کے لیے اُس قدر خشک نہیں

ہونا چاہئے جیسے ایک کالج کا معلّم طالب علموں کے لیے کہ اُس کو اتنے وقت
میں تعلیم سے غرض ہے اور کچھ نہیں۔ بچوں کی تربیت میں تعلیمی سختی کے ساتھ
مشفقانہ محبت کے مظاہرات کی بھی ضرورت ہی اور شریعت جو ایک
فطری زندگی کی تشکیل کرنا چاہتی ہی وہ اس کو خاص اہمیت دیتی ہی وہ یہ
نہیں چاہتی کہ آپ اپنی اولاد کے سامنے تیوریوں پر بل ڈالے رہیئے
اور ہمیشہ اُن سے ڈانٹ ہی کر بات کیجئے بلکہ حسب موقع اظہار محبت بھی
کیجئے اور یہ وہ چیز ہے جس میں شخصی وقار، متانت، شائستگی کے حدود بھی
ختم ہو جاتے ہیں۔ بچوں کو پیار کرنا۔ ملاطفت سے کام لینا ایک طرح کی عبادت
ہے رسول اللہؐ کی حدیث ہی :۔ من قبّل ولدہ کتب اللّٰہ لہ حسنۃ،
جو اپنے بچہ کو پیار کرتا ہے خدا ایک نیکی اُس کے نامۂ عمل میں تحریر فرماتا ہے"
رسالتمآب سے بڑھ کر عالم میں کس کی عظمت ہوگی۔ مگر آپ خود بچوں کے
ساتھ جو طرزِ عمل اختیار فرماتے تھے اُس کے تاریخ و حدیث دونوں گواہ
ہیں بعض انانیت پسند اور متکبر اشخاص اُس وقت بھی اس پر اعتراض کرتے
تھے اور بہت سے لوگ اس وقت بھی دبی زبان سے کہتے ہیں کہ یہ
چیزیں عظمت کے خلاف ہیں مگر یہ لوگ عظمت نفس کا صحیح معیار نہیں سمجھتے
ہر چیز کا ایک محل ہوتا ہے اور کبھی موقع ہوتا ہی کہ انسان باختیار خود
اپنی عظمت کے درجہ سے نیچے اترے۔ بچوں کے ساتھ وقار و تمکنت کو قائم

رکھنا اصول انسانیت کے خلاف ہے۔

روایت میں ہے کہ کان رسول اللہ یقبل الحسن والحسین فقال الاقرع بن حابس ان لی عشرۃ من الولد ماقبلت احدا منہم فقال رسول اللہ من لا یرحم لا یرحم " رسالتمآبؐ امام حسن وامام حسین اپنے دونوں نواسوں کو پیار کر رہے تھے، اقرع بن حابس نے (یہ نجد کے رؤسا میں سے تھا) کہا کہ میرے تو دس فرزند ہیں میں نے کبھی کسی کو پیار نہیں کیا۔ حضرت نے فرمایا کہ جس کے دل میں شفقت ومہربانی نہ ہو وہ خود قابل مہربانی نہیں ہے "

بچوں کے ساتھ یہ طریقہ بھی اختیار کرنا غلط ہے کہ شروع سے ہر بات میں اُن کو ڈرایا جائے اور خوف ودہشت دلائی جائے۔ " ہوّا" اور " جو جو" اور " بی شادی" وغیرہ کے ناموں سے خواہ مخواہ ڈرانا بالکل اصول تربیت کے خلاف ہے۔ اسی طرح یہ طریقہ کہ بچوں کو تنہا مقام پر جانے نہ دیا جائے مُردوں سے الگ ہٹایا جائے۔ مُردہ کی صورت نہ دیکھنے دی جائے یہ سب طریقے صحیح نہیں ہیں ایسے لوگ اپنے بچوں کو اُن کی آئندہ زندگی میں مشکلات کے مقابلہ کے لیے تیار نہیں کرتے بلکہ اُن کے نفس میں کمزوری پیدا کرتے ہیں۔ یہ چیز عرب میں نہیں تھی اس لیے احادیث میں اُس کا تذکرہ نہیں ملتا۔ بے شک آپ کے یہاں کے علماء اور رہنماؤں نے دین کو اس کا احساس

تھا چنانچہ جناب تاج العلمار نے تحریر فرمایا ہے کہ ہمارے والد ماجد جناب
سلطان العلمار طاب ثراہ ہم کو بچپنے سے خاص طور پر مُردون کی بھیانک
صورتین دیکھنے کی عادت ڈالتے تھے اور کسی جگہ کچھ ڈاکو مارے گئے اور اُن
کے سر وہان سے بھیجے گئے (کیونکہ اُس زمانہ میں محکمۂ فوجداری اور دیوانی
سب سلطان العلمار کے اختیار میں تھا) تو وہ سر ایک روز تک ہمارے
پلنگ کے قریب رکھے رہے یہ سب اسی لیے تھا کہ خوف دل سے نکلے اور بچہ
میں ایسے مناظر کے دیکھنے سے رعب ودہشت نہ پیدا ہو

تحصیل علم کی اہمیت

—— ؛ (اور) ؛ ——

علم کے شرعی حدود

تعلیم وتربیت انسان کی زندگی کے لئے لازمی چیز ہے اور اسلام
نے علم کی اہمیت پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔ اسی سلسلہ میں ضرورت ہے
کہ علم کے شرعی حدود پر تبصرہ کر دیا جائے، حدیث مین ہے:۔ العلم
فریضة علیٰ کل مسلم "علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے"

اس میں عام طور پر "ومسلمة" کا جزو حدیث کے آخر میں زبان زد خلق ہے
وہ بالکل الحاقی ہے۔ اصل حدیث مین اس کا وجود نہین ہے۔

اس کے ساتھ قرآن مجید میں ہی لایستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون۔ "ہرگز برابر نہیں ہیں وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور وہ کہ جو علم نہین رکھتے۔

بعض لوگ اس قسم کے آیات و احادیث کو لے کر یہ استدلال پیش کرتے ہیں کہ اس میں کسی علم خاص کی قید نہین ہی لہذا ہر علم کا حاصل کرنا مطلوب شرع ہوگا اور انسان کا فرض مذہبی قرار پائے گا۔

کیا حقیقتہً یہ استدلال درست ہے؟

علم کے معنے لغت میں دانستن یعنی جاننے ہی کے ہیں لیکن کیا ہر چیز کا جاننا ہر شخص کے لیے سبب فضیلت ہی؟ اگر ایسا ہو تو دنیا میں عالم اور جاہل کی تفریق ہی بیکار ہے کیونکہ ہر انسان کو اپنے شعبۂ زندگی میں کچھ خاص معلومات ہوتے ہیں جو دوسروں کو نہیں ہیں۔

ایک جنگل میں بسر کرنے والا فقیر جنگل کی بہت سی چیزوں کا علم رکھتا ہے جو بڑے فلاسفر اور حکما کو نہیں معلوم اور ایک دریائی سفر کرنے والا کشتی ران دریا اور اس کے جزائر کے متعلق بہت سے معلومات رکھتا ہے ایک کاشتکار زمین کے بونے، جوتنے کے اسرار جانتا ہی۔ ایک لوہار لوہے کے خواص و کیفیات کے متعلق علم رکھتا ہی اور ہر شخص اپنے خاندان اپنے آباؤ اجداد اور خاص اپنے گھر کے متعلق وہ بہت سی باتیں جانتا ہے جو کسی

دوسرے کو معلوم نہیں ہے۔ اگر یہی جاننا صرف معیارِ علم ہو تو پھر جاہل کا وجود ہی باقی نہیں رہتا اور اس صورت میں یہ کہنا کہ عالم اور غیر عالم مساوی نہیں ہیں ایک بے معنی بات ہی کیونکہ غیر عالم کی صنف تو عنقا رہے جس کا وجود ہی نہیں ہے۔

معلوم ہوتا ہی کہ علم کا یہ وسیع اور عام مفہوم مراد نہیں ہی بلکہ اس کے لیے کوئی اصطلاحی مفہوم قرار دیا گیا ہی یا اُس کی کوئی خاص صنف مراد ہے

اب ہم کو ضرورت ہی کہ ہم اُس اصطلاحی مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کریں یا اُس صنف خاص کو دریافت کریں جو واقعی مقصود ہی۔

اس کے لیے جب ہم عقل سے کام لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہی کہ وہ جاننا انسان کے لئے قابلِ مدح ہے جو کارآمد حیثیت رکھتا ہو۔

لیکن "کارآمد" کی تعیین ہر انسان کے نقطۂ نظر سے بدل جاتی ہی۔ ایک کسان اُس کو کارآمد سمجھے گا جو اُس کے شعبہ سے متعلق ہی۔ ایک طبیب اُسے کارآمد سمجھے گا جو اُس کے مطلب کی چیز ہے اور چونکہ یہاں نقطۂ نظر کی صحت وعدم صحت سے بحث نہیں ہی اس لیے یہ بھی کہوں کہ ایک مغنی یعنی گانیوالا اُس چیز کو کارآمد کہے گا جو اُس کے مذاق سے تعلق رکھتی ہو۔ اور جب اس کا معیار یہ ہی تو شارع اُسی چیز کو علم سمجھے گا جو اُس کے نقطۂ نظر سے کارآمد ہو۔

اب دیکھیے کہ شارع کا نقطۂ نظر کیا ہی۔ انسان کی اعتقادی وعملی

آراستگی اور تکمیل لیکن اس آراستگی کے درجے ہیں۔ ایک درجہ وہ ہے جو ہر انسان کے لیے ضروری ہے اور اُس سے کوئی مستثنیٰ نہیں ہے۔ اُس سے متعلق علم بھی واجب ہونا چاہیئے اور ایک وہ درجہ ہے جس تک پہنچنا ممدوح و مستحسن ہے اُس سے متعلق علم بھی ایسا ہی ہوگا اور بعض امور وہ ہیں جو خود انسان کے لیے جواز کی حد میں ہیں، نہ اُن کے فعل کو کوئی خاص ترجیح ہے نہ ترک کو، ان کا علم بھی اس حیثیت سے جائز و مباح کی حیثیت رکھتا ہوگا۔ وہ نہ واجب ہوگا اور نہ مستحب۔

اب دیکھیے وہ چیز جو ہر انسان کے لیے ضروری ہے وہ کیا ہے؟ وہ اصول دین کا اجمالی دلیل کے ساتھ اعتقاد حاصل ہونا اور اعمال و افعال میں واجبات کا پابند اور محرمات کا تارک ہونا یہ وہ کم از کم درجہ ہے جو ہر انسان سے مطلوب ہے اور کوئی شخص اُس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اس لیے یہ مقدار علم کی واجب عینی ہوگی یعنی ہر ہر متنفس کا افراد انسان میں سے بلوغ و عقل کے ساتھ یہ فرض ہوگا کہ وہ مسائل اعتقادیہ کو دلیل اجمالی کے ساتھ اور واجبات و محرمات کے شرعی احکام کو جانتا ہو اور ان کی معرفت حاصل کرے۔

اس کے بعد اصول عقائد کی تفصیلی واقفیت حاصل کرنا بسط و تشریح کے ساتھ، اور مسائل دینیہ کو نظر و استدلال کے ساتھ جاننا جس کا نام ہے اجتہاد، یہ ہر انسان پر فرض عین نہیں ہے۔ ورنہ پھر دنیا کی دوسری ضرورتیں پوری

نہ ہوسکتیں لیکن چونکہ مختلف ادیان و مذاہب کے اعتراضات کو دور کرنا اور ناواقف افراد کو صحیح مسائل سے واقف بنانا ایسے افراد کے وجود پر موقوف ہے اس لیے ایک جماعت کا ہر زمانہ میں رہنا ضروری ہے جو علم کے اس درجہ پر فائز ہو اس لیے اس درجہ پر علم کی تحصیل کرنا واجب کفائی ہے یعنی سب پر فرض ہے لیکن جب ایک یا چند افراد ایسے پیدا ہو جائیں جو اس ضرورت کو پورا کر سکتے ہوں تو پھر دوسروں سے یہ وجوب ساقط ہو جائے گا۔

اسی طرح دوسرے بعض علوم جن پر نظم زندگی موقوف ہے جیسے علم طب، چونکہ عام نظام اسباب کی بنا پر امراض کے دفعیہ کا ذریعہ علاج میں منحصر ہے اس لیے ضرورت ہے کہ ایسے افراد موجود رہیں جو انسان کی صحت جسمانی کی نگرانی کر سکیں۔

یوں ہی غذا اور لباس اور سکونت وغیرہ کے ضروریات کے لیے وہ صنعتیں جن سے کہ یہ ضروریات پورے ہوتے ہیں بقدر ضرورت کفائی حیثیت سے واجب ہیں۔

اس کے بعد وہ علوم جن سے مقصود کسی طرح خلق خدا کو جائز فائدہ پہونچانا ہو لیکن وہ ضروریات زندگی میں داخل نہ ہوں تو وہ مستحب قرار پائیں گے یعنی جب اس قصد سے انجام دیے جائیں کہ ان سے خلق کو فائدہ حاصل ہو تو ان پر ثواب بھی عطا ہوگا۔

باقی رہے ایسے علم جن پر کوئی اس طرح کا مقصد مترتب نہیں ہے مثلاً فلاں ملک سے فلاں ملک کا فاصلہ کتنا ہے؟ وہاں کی مردم شماری کتنی ہے؟ وہاں کی پیداوار کیا ہے؟ وہاں کی اقتصادی حالت کیسی ہے؟ وہاں کا نظام سلطنت کیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

یا یہ کہ آج سے اتنے صدی پہلے کون بادشاہ تھا؟ اس کے دور حکومت کے اہم خصوصیات کیا تھے؟ اس کے زمانہ میں حدود سلطنت کتنے تھے؟ اس کے زمانہ میں کون سے انقلابات ہوئے اور کیا کیا اہم واقعات رونما ہوئے وغیرہ وغیرہ۔

ان چیزوں کا علم حاصل کرنا جائز و مباح کے حدود میں آئے گا یعنی انسان اپنے فاضل اوقات زندگی میں ان باتوں کو بھی جان لے تو کوئی مضائقہ نہیں یہی وہ چیز ہے جس کو رسالتمآبؐ نے فرمایا اس وقت جب آپ مسجد میں تشریف لائے اور ملاحظہ فرمایا کہ ایک شخص کے گرد لوگوں کا مجمع ہے۔ حضرت نے پوچھا یہ کون ہے۔ لوگوں نے کہا "یہ علامہ ہے"

آپ نے فرمایا کہ وما العلامۃ "یہ علامہ کیا چیز ہے؟"

لوگوں نے کہا یہ انساب عرب اور تواریخ اور عرب کی لڑائیوں کے حالات سے واقف ہے۔ حضرت نے فرمایا یہ ایسا علم ہے کہ نہ اس سے فائدہ پہنچتا ہے نہ نقصان"

دیکھیے یہاں لغوی حیثیت کا لحاظ کیا گیا ہے جو "علم" کا اطلاق اس پر کیا گیا لیکن اس کے بعد فرماتے ہیں العلم ثلثة آیة محکمة او سنة قائمة او فریضة عادلة علم تو بس تین ہیں (یہ علم کے اصطلاحی معنی ہیں جو شرعی نقطۂ نظر سے بیان کیے گئے ہیں)

ایک محکم آیات، دوسرے غیر منسوخ احادیث، تیسرے احکام واجبہ فرماتے ہیں وماعدا ذلك فضل۔ "اس کے سوا جو کچھ ہے وہ پھر فاضل چیز ہے"

اور اگر علم ایسا ہو جس سے مضرت پہونچنے کا اندیشہ ہے یا اس کا معصیت سے تعلق ہی تو وہ حرام ہوگا جیسے علم موسیقی، وہ بھی اس بنا پر کہ علم اس کا موقوف عمل ہوتا ہے۔ ورنہ ان مسائل کو لفظی حیثیت سے سننا یا جاننا حرام نہیں ہے علم سحر اس کا حاصل کرنا بھی حرام ہی مگر یہ کہ رد سحر کے لیے ہو۔ تو اس وقت میں جائز ہوگا۔ تیسرے کتب ضلال یعنے ادیان باطلہ کی کتابوں کا خرید کرنا محفوظ کرنا۔ مطالعہ کرنا اور نشر واشاعت کرنا، یہ سب ممنوع ہی جب تک اس کے ساتھ رد و ابطال کا قصد نہ ہو، اگر یہ قصد ہو تو جائز ہوگا بلکہ کسی حد تک واجب ہوگا تاکہ ان شبہات و اعتراضات کا دفعیہ ہو سکے اور حمایت حق کا فرض انجام پذیر ہو۔

تعلیمِ نسواں

علم کا معیار یہ قرار پایا کہ جو کار آمد علم ہو وہ مستحسن ہے مگر کار آمد ہونا ہر شے کے لیئے اُس کے اعتبار سے ہوتا ہے یعنے جو مقصد کسی شے کا ہو اور جو اُس کا مخصوص عمل ہو اُس کی حیثیت سے مفید ہو تو وہ کار آمد سمجھا جائے گا اور اگر اُس حیثیت سے مفید نہیں ہے تو بے کار ہے۔

قدرت نے نوع انسانی کو دو صنفوں پر منقسم کیا ہے۔ مرد اور عورت ان کے خواص فطری مختلف، ضروریات زندگی مختلف، فرائض و اعمال مختلف، اس لیے کیسے ہو سکتا ہے کہ تعلیم و تربیت میں ان کو ایک ہی صف میں جگہ دیدی جائے اور دونوں کے لیئے ایک ہی طرح کی تعلیم کو کار آمد سمجھا جائے بے شک عورت کو ترقی حاصل کرنا چاہیئے جس طرح مردوں کو ترقی کرنا چاہیئے۔ لیکن مرد کو مرد رہ کے ترقی کرنا لازم ہے اور عورت کو عورت رہ کے۔ دوسری لفظوں میں یہ عرض کروں کہ تعلیم مرد کو وہ ہونا چاہیئے جس سے وہ کامل مرد بن جائے اور عورت کو ایسی تعلیم جس سے وہ کامل عورت بنے۔

یہ خواہش کہ عورتوں کو میدان عمل میں بالکل مردوں کے دوش بدوش آنا چاہیئے اُس وقت صحیح ہو سکتی تھی جب مرد اُن فرائض و اعمال میں عورت کے ساتھ شریک ہونے پر تیار ہو جاتا جو عورت سے متعلق ہیں لیکن جبکہ فطرت نے عورت کے لیے کچھ مخصوص فرائض قرار دیدیئے ہیں جو بالکل اُسی کے ساتھ

وابستہ ہیں اور جن میں کسی طرح مرد اُس کے ساتھ تبادلہ نہیں کرسکتا تو پھر مردوں کے لیے بھی کچھ فرائض مخصوص ہونا چاہئیں جن میں وہ عورتوں کو شرکت کی دعوت نہ دیں۔

یہ بھی عورت کی طبیعت کا ایک کمزور پہلو ہے کہ وہ مرد کی باتوں میں آجاتی ہے جس طرح مردوں نے اُس کو رکھا اُسی کو اُس نے اپنے لیئے بہتر سمجھا اور آج جبکہ مرد ہی "آزادی آزادی" پکار رہے ہیں اور یہ صدا بلند کر رہے ہیں کہ عورتوں کو میدان ترقی میں باہر آنا چاہئیے تو اسے بھی عورتیں سمجھ رہی ہیں کہ یہ ہماری خیر خواہی ہے۔ اور ہمارے لیے یہی مناسب ہے، حالانکہ وہ دیکھیں تو اس میں صاف مردوں کی خود غرضی نمایاں ہوگی۔ معلوم ہوگا کہ مرد مشکلات زندگی کے پورا کرنے سے ہمت ہار چکا اور وہ عورت کو صرف اپنی مدد کے لیے بلا رہا ہے۔ حالانکہ اس سے عورت کو خود کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا بلکہ اُس کی "نسائیت" کو انتہائی نقصان ہوگا۔

مرد اور عورت کے تشکیل جسمانی اور اُن کے طبعی نظام زندگانی ہی سے اُن کا مختلف المقصد ہونا بالکل نمایاں ہے۔

پھر جب یہ اختلاف اپنے مقام پر قائم ہے اور مٹ نہیں سکتا تو خواہ مخواہ اُن کو کھینچ کر مرد کے پہلو میں لانے سے فائدہ کیا ہے۔

عورت بہر حال عورت ہے اور اُس کے لیے صحیح تعلیم وہی ہوگی جو اُس کو ایک

ترقی یافتہ عورت بنا دے۔ تعلیم بے شک ضروری ہی لیکن وہ اُس کے لحاظ سے ہونا چاہیئے۔

جہاں تک اعتقادی مسائل کا تعلق ہے مرد اور عورت دونوں مشترک ہیں۔ اسی طرح فرائضِ الہیہ جس طرح مردوں کے لیے ہیں اُسی طرح عورتوں کے لیے۔ لہذا ان چیزوں کا علم حاصل ہونا جس طرح مردوں کے لیے ضروری ہے اُسی طرح عورتوں کے لیئے بھی۔

بے شک احکام شرعیہ میں ممکن ہی کہ بعض چیزیں ایسی ہوں جن کا تعلق عورتوں ہی سے ہے مردوں سے نہیں جیسے خاص خاص مسائل طہارت، یا جن کا تعلق مردوں کے ساتھ ہو عورتوں کے ساتھ نہیں جیسے احکام جہاد اس بنا پر کہ جہاد عورتوں سے ساقط ہے۔ ایسے احکام کے ان سب کو جاننے کی ضرورت نہیں ہی بلکہ جس کی ضرورتوں سے اُن احکام کا تعلق ہی اُسی صنف کو اُس کا علم بھی حاصل کرنے کی ضرورت ہی۔

اس کے آگے علم کے وہ درجے جو نظام دنیا کے لحاظ سے ضروری ہیں اُن میں تفریق پیدا ہونا ناگزیر ہے کیونکہ مرد کے ضروریات عورت سے مختلف ہیں اسلام نے عورت اور مرد کے درمیان داخلی اور خارجی حدودِ عمل کی تقسیم کردی ہی۔ طلب معیشت اور جد و جہد مرد کا کام ہی اور انتظام خانہ داری عورت سے تعلق ہے اس لیئے عورت کے لیئے مقدم اُن چیزوں کا حاصل

کرنا ہی جو اُس کے ضروریات سے متعلق ہیں۔

اسی بنا پر حدیث میں وارد ہوا ہے: "علموھن الغزل والخیاطة ولا تعلموھن الکتابة" "انھیں کاتنے اور سینے کی تعلیم دو اور انھیں انشا پردازی اور تحریر کی تعلیم نہ دو۔"

ظاہر میں اس حدیث سے یہ مستفاد ہوتا ہی کہ کتابت کا سیکھنا عورت کے لیے ممنوع ہی اس لیے بعض علمار بھی فتوے دیتے ہیں کہ کتابت اُس کے لیے مکروہ ہے مگر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ایسا نہیں ہی۔

جس طرح امر یعنی کسی شے کی طلب وجوب یا استحباب کا پتہ دیتی ہی مگر اُس وقت کہ جب اس کے پہلے نہی نہ ہو یا توہم ممانعت کا نہ ہو لیکن اگر پہلے کسی امر کی ممانعت ہوئی ہو اور پھر یہ کہا جائے کہ "اُس کام کو کرو" تو اس سے صرف اجازت مقصود ہوتی ہی کہ وہ حکم اب برطرف ہو گیا یا کسی شے کے متعلق اس توہم کا موقع ہو کہ وہ ممنوع ہے اور پھر اُس کا حکم دیا جائے تو اُس سے مطلب یہ ہو گا کہ اُس توہم ممانعت کا دفعیہ کیا جائے اسی طرح اگر کسی شے کے حکم وجوبی یا استحبابی کے بعد اُس سے منع وارد ہو تو وہ حرمت وکراہت کی دلیل نہ ہوگی بلکہ اُس سے مقصود یہ ہو گا کہ اس کا حکم اب نہیں ہے یا کسی شے کے متعلق استحباب ومطلوبیت کا شبہہ ہو اور اُس کے متعلق نہی وارد ہو تو اس سے

اُس مطلوبیت کی نفی مقصود ہوگی اور بس۔
اب دیکھیے کہ چونکہ مردون کے لیے کتابت حاصل کرنے کی تاکید ہے
اور ظاہری طور پر اس خیال کی کافی گنجائش ہی کہ عورتون کے
واسطے بھی کتابت حاصل کرنے کا حکم ہوگا۔ نیز غزل و خیاطت کا اُن
کے لیئے پہلے حکم دیا گیا ہے لہذا اس لا تعلموهن الكتابة "انھیں کتابت
کی تعلیم نہ دو" کے معنی صرف اتنے ہون گے کہ ان کے لیے کتابت کی تعلیم
کا حکم اُس طرح نہین ہی جس طرح کاتنے اور سینے پرونے کا۔ یا مردون
کے لیئے جس طرح اس کی تاکید ہی۔ اُس طرح عورتون کے لیے نہیں ہے۔
اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ وہ اُن کے لیے حرام یا مکروہ ہے۔
عورتون کو تعلیم حاصل کرنے سے کوئی مانع نہین ہے۔
علاوہ ضروری اعتقادات اور مسائل کے اس حد تک اُن کو دوسرے
معلومات حاصل ہو جانا بہتر ہیں جو نظام زندگی میں مفید ہون جیسے اصول
حفظان صحت وغیرہ پھر اگر تمام ضروری باتون کے پورا کرنے کے بعد اُن
کے پاس وقت فاضل ہو تو دوسرے علوم کے حاصل کرنے میں بھی کوئی
روک ٹوک نہین مگر ضرورت اس بات کی ہی کہ اُن کے نسوانی خصوصیات
محفوظ رہیں۔
اس کی اجازت کسی طرح صحیح نہین کہ وہ اسکولون اور کالجون میں جا کر

مردوں کے دوش بدوش تعلیم حاصل کریں۔

آج تعلیم نسوان کے مبلغین کی طرف سے مثال میں پیش کیا جاتا ہے سیدۂ عالم کو کہ اُن کا علمی پایہ کتنا بلند تھا اور جناب زینب کو جن کے متعلق امام نے فرمایا عالمۃ غیر معلّمۃ لیکن اس سلسلہ میں اس پر غور نہیں کیا جاتا کہ سیدۂ عالم کے ذرائع معلومات کیا تھے۔ اسکول اور کالج تو بہت دُور ہے دنیا کی تاریخ سے یہ تک ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ سیدۂ عالم کبھی مسجد میں اپنے پدر بزرگوار کے موعظہ میں جاکر شریک ہوئی ہوں۔

بے شک روایت سُنی ہے کہ جب امام حسن اور امام حسین مسجد سے آتے تھے تو سیدہ اپنے بچوں سے اکثر دریافت کر لیتی تھیں کہ بابا نے موعظہ میں کیا بیان فرمایا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ سیدہ کو شوق تھا اُن معلومات کے حاصل کرنے کا اور یہ بھی بالکل ظاہر ہے کہ رسول اللہ کو سیدہ کی خاطر انتہائی عزیز تھی مگر پھر کچھ پابندی تھی جو نہ سیدہ نے مسجد میں جانے کی خواہش کی اور نہ رسولؐ نے سیدہ کو اس کی اجازت دی سیدۂ عالم نے ہمیشہ کے لیے صنف اناث کے واسطے مثال قائم کردی کہ اگر وہ تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہوں تو اُس کا طریقہ یہ ہے کہ مرد تعلیم یافتہ ہوں اور وہ خود اپنی عورتوں کو گھر کے اندر تعلیم دیں۔

اس میں بڑے اور چھوٹے کا سوال بھی کوئی چیز نہیں۔ اگر موقع ہو تو ماں اپنے بیٹے سے علمی فائدہ حاصل کر سکتی ہے۔

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ شرعی پردہ عورتوں کے لیے برقع اوڑھ کر گھر سے باہر نکلنے کا مانع نہیں ہے مگر معلوم ہونا چاہیے کہ ضرورت کے لحاظ جواز کے حدود چاہے کچھ ہوں لیکن مطلوب اور بین شرع کا عورتوں کے لیے گھروں کے اندر ہی رہنا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو عورتوں کے واسطے فرائض شرعیہ میں استثنا نہ کیا جاتا۔

نماز جمعہ اُس صورت میں کہ جب وجوب عینی کی صورت رکھتی ہو، مرد کے لیے واجب، عورتوں پر سے وجوب ساقط۔

نماز جماعت کی فضیلت مرد کے لیے ثابت۔ عورتوں کے لیے نہیں۔

مسجد کی فضیلت، مرد کے لیے اُس کے درجے بلند ہوتے ہیں کثرتِ اجتماع کے لحاظ سے اس لیے گھر سے زیادہ ثواب مسجد میں اور مسجد محلہ سے زیادہ ثواب مسجد جامع میں، کیونکہ اجتماع وہاں زیادہ ہوتا ہے مگر عورت کے لیے یہ حکم کہ خارج بیت یعنی گھر کے باہر نماز پڑھنے سے زیادہ ثواب گھر کے اندر کا اور صحن سے زیادہ ثواب اندر کے دالان یا کوٹھری کا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شرع کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ مجھے اُن لوگوں سے جو تعلیم نسوان کے حامی ہیں وہ پردہ کے مخالف ہیں اس کی شکایت نہیں ہے

کہ وہ یہ رائے کیوں رکھتے ہیں۔ ممکن ہے ان کے دماغ نے یہی فیصلہ کیا ہو مگر مجھے اُن سے شکایت ہے اس امر کی کہ وہ شریعت اسلام کے ہدایات کو اپنے موافق قرار دینا چاہتے ہیں حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ یوں آپ اس کو نہ مانتے ہوں یہ آپ کا فعل ہے مگر یہ نہ کہئے کہ شریعت بھی ہمارے ہی موافق ہے

والدین اگر پابند شریعت ہیں تو انھیں اپنی لڑکیوں کو اخلاقی تربیت کے ساتھ ضروری تعلیم بھی ضرور دینا چاہیے مگر اس کا خیال رہے کہ وہ اُن کے مزاج فطری کے خراب کرنے کا ذریعہ نہ ہو اور اُن کی شرم و حیا کا مشریبہ جو اُن کا اعلیٰ ترین زیور ہے کسی طرح برباد نہ ہونے پائے۔

عبادت کی ابتدائی مشق

-- ✣ (اور) ✣ --

نماز کی تاکید

جس طرحِ بچوں کو تعلیم کا حکم دیا گیا ہے اور اخلاقی تربیت کی ضرورت پہ زور دیا گیا ہے اسی طرح انھیں عبادت و طاعات کی عادت ڈالنے کی بھی تاکید ہے۔

چھ یا سات برس کی عمر سے نماز پڑھنے کی عادت ڈالنا چاہیے۔ اس میں جتنا زمانہ گزرتا جائے اور بلوغ کی منزلِ قریب آتی جائے اتنی زیادہ

تشدد و تاکید کی ضرورت ہے۔

امام جعفر صادقؑ کی حدیث ہے آپ سے دریافت کیا گیا فی کم یؤخذ الصبی بالصلوٰۃ "کتنی وہ عمر ہے جس میں بچہ کو نماز کا پابند بنانا چاہیے حضرت نے فرمایا:- فیما بین سبع سنین و ست سنین۔

"سات اور چھ برس کے درمیان میں" اس "درمیان" کے معنی وہی ہیں جنھیں میں نے اس کے پہلے تعلیم و تربیت کے مسئلہ میں واضح کیا ہے کہ درحقیقت شارع نے اس مقام پر تعبدی پابندی سے نہیں کام لیا ہے بلکہ ایک تخمینہ بتلایا ہے کہ تقریباً اتنی عمر میں بچہ عموماً سمجھنے اور سیکھنے کے لائق ہو جاتا ہے۔

محمد بن مسلم کی روایت سے اس پر کافی روشنی پڑتی ہے فی الصبی متی یصلی "بچہ کے بارے میں امام سے دریافت کیا کہ اُسے کب نماز پڑھنا چاہیے۔ فرمایا اذا عقل الصلوٰۃ "جب وہ نماز کو سمجھنے لگے۔ پوچھا متیٰ یعقل الصلوٰۃ وتجب علیہ "کب نماز کو سمجھنے لگتا ہے اور نماز اس کے لیے ثابت ہوتی ہے؟ حضرت نے فرمایا "چھ برس کے سن میں"۔

معلوم ہوتا ہے کہ معیار اس کا یہ ہے کہ بچہ میں عقل و شعور پیدا ہو جائے۔

امام جعفر صادقؑ کی حدیث ہے:-

اذا اتی علی الصبی ست سنین وجب علیہ الصلوٰۃ واذا اطاق الصوم وجب علیہ الصیام "جب بچہ کا چھ برس کا سن ہو تو نماز کا حکم اُس کے

لیے ثابت ہے اور جب روزہ کی طاقت ہو تو روزہ رکھنے کا حکم ہے "

گذشتہ روایت میں راوی کے سوال میں اور اس حدیث میں امام کے جواب میں " وجوب " کی لفظ ہے جس سے شبہہ ہوتا ہے کہ وہ واجب ہے مگر کلمات ائمہ کے تلاش و جستجو سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وجوب۔ تحریم استحباب کراہت اور اباحت کے الفاظ اصطلاحی طور پر موجودہ معانی میں علم فقہ کی تدوین کے ساتھ فقہا کے درمیان قرار پائے ہیں اس کے پہلے قرآن و حدیث میں زیادہ تر یہ لغوی معنی کی حیثیت سے استعمال ہوتے تھے۔ اس لیے واجب کی تعبیر مستحب ہے اور مستحب کی تعبیر واجب ہے، اسی طرح حرام و مکروہ کے الفاظ میں ایک کا دوسرے میں استعمال کثرت سے ہوتا ہے۔ یہ قرائن مقام اور ادلۂ خارجیہ سے وابستہ ہے کہ اصطلاحی حیثیت سے وجوب یا استحباب کا پتہ چلے۔

چونکہ متواتر احادیث اس امر کے ثبوت میں موجود ہیں کہ بچہ جب تک بالغ نہ ہو اس وقت تک تکالیف شرعیہ اس سے متعلق نہیں ہوتے اور بلوغ کی حد بھی مقرر کر دی گئی ہے کہ وہ پندرہ برس ہے اس لیے ان احادیث میں مراد استحباب ہے اگرچہ اس کو کہیں وجوب کی لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

امام محمد باقرؑ کی حدیث میں ہے:۔ انا نامر صبیاننا بالصلوٰۃ اذا کانوا بنی خمس سنین فمروا صبیانکم بالصلوٰۃ اذا کانوا ابنی سبع سنین۔

ارشاد ہوتا ہی کہ "ہم لوگ (اہلبیت معصومینؑ) اپنے بچوں کو نماز پڑھنے پر مامور کرتے ہیں جب وہ پانچ برس کے ہوں لہذا تم لوگ (کم از کم) اپنے بچوں کو نماز کے لیے مامور کرو جب وہ سات برس کے ہوں۔"

یہ اس اصول پر مبنی ہی کہ جو رہنمایان مذہب ہوں اُن کو ضرورت ہی کہ مذہبی احکام کی طرف توجہ اُس سے زیادہ کریں جتنا کہ عام لوگوں کو وہ دعوت دیتے ہیں۔

اس حدیث کا لب و لہجہ استحباب کو صاف بتلاتا ہی اس لیے کہ واجبات میں شرع کی جانب سے تعبدی پابندی ہوتی ہی اور وہ سب کے لیے عمومیت رکھتی ہی۔

یہ تفریق اور اس طرح اپنے یہاں کی مثال پیش کرکے دعوت عمل دینا استحباب کے لیے زیادہ مناسب ہے۔

اب اختلاف ہی علما میں کہ یہ بچہ جو نماز روزے وغیرہ ادا کرتا ہی یہ عبادت کی حیثیت رکھتے ہیں یعنی اُس کو ثواب بھی اُن اعمال کا حاصل ہوگا یا صرف تمرینی حیثیت رکھتے ہیں یعنی مشق کے لیے انجام دیئے جاتے ہیں۔ اسی بنا پر یہ عام طور سے مشہور ہوگیا ہی کہ بچہ جو نماز پڑھتا ہی اُس کا ثواب اُسے نہیں ہوتا بلکہ والدین کو ہوتا ہی۔

اس کی بنیاد اسی امر پر ہے کہ جب وہ کوئی عبادت نہیں اور صرف مشق ہی تو یہ

ظاہر ہے کہ مشق کرانے کا تعلق ماں باپ سے ہے لہذا اُن ہی کو اس کا ثواب بھی ہے۔

میری نظر میں اس مسئلہ میں کلیہ طور پر کوئی فیصلہ کرنا صحیح نہیں ہے بلکہ اس کی صورتیں مختلف ہوتی ہیں۔

ایک صورت تو یہ ہے کہ بچہ کو اتنا احساس ابھی پیدا نہیں ہوا ہے کہ وہ نماز کو ایک خداوندی حکم کے قصد سے انجام دے لیکن والدین عبادت کا شوق پیدا کرنے کے لیۓ اُس کو نماز پڑھنے کی ہدایت کریں یا وہ ایک شریر اور بد طینت لڑکا ہے کہ وہ باوجود یہ سمجھنے کے کہ یہ ایک حکم خدا ہے اور اچھی بات ہے لیکن پھر بھی اگر والدین اُس کو مجبور نہ کریں تو وہ نماز نہ پڑھے گا۔ وہ نماز پڑھتا ہی صرف ماں باپ کی زبردستی سے اور اُن کے ڈر کے مارے اور اس لیۓ وہ اکثر ماں باپ کو فقرہ میں بھی لے لیتا ہے اور نماز کو اُڑا دیتا ہے، ایسی صورت میں بے شک یہ عمل عبادت نہیں ہے اس لیۓ کہ قصد قربت جو عبادت کا حقیقی جوہر ہے وہ اُس میں موجود نہیں، ایسا عمل اگر کوئی بالغ و عاقل انسان کرے تو وہ بھی قابل قبول نہ ہوگا اس عمل کے ادا کرنے کا سہرا صرف ماں باپ کے سر ہے جو عادت ڈالنے کے لیے بچہ کو اُس کے ادا کرنے پر مجبور کرتے ہیں وہ یقیناً اُس کی آئندہ زندگی کے لیے مفید ہے اس لیے کہ اس ذریعہ سے

ممکن ہے ایک وقت میں اُس کو احساس فرض بھی پیدا ہو جائے اور وہ صحیح طریقہ سے عبادت کو بجالانے لگے، اس لیے اس وقت اس نماز و روزہ کے ادا کرانے کا ثواب ان ہی ماں باپ کو ملنا چاہیے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ بچہ میں خود ذوق عبادت ہی اور اُسے شوق ہے کہ وہ اس عمل کو جو خدا کی جانب سے اُس کے بندوں پر عائد ہے بجالائے۔ یہاں تک کہ ممکن ہے کسی وقت والدین روکتے بھی ہوں کہ روزہ نہ رکھو یا نماز نہ پڑھو تو وہ بچہ نہیں مانتا اور اُسے اضطراب پیدا ہوتا ہی کہ کسی طرح وہ اُس عبادت کو انجام دے لے۔ ایسے بچے یقیناً جو اعمال بجا لائیں اُن کے ثواب کا اُنھیں استحقاق ہی بلوغ کا زمانہ مقرر کیا جانا ایک تفضل ہے خداوند عالم کی جانب سے جس کی بنا پر پندرہ برس تک انسان فرائض الٰہیہ سے سبکدوش رکھا گیا ہے ورنہ عقلی حیثیت سے اکثر بچے اس کے بہت پہلے اس قابل ہو جاتے ہیں کہ اُن پہ پابندیاں عائد کی جاسکیں، پندرہ برس تک آزاد رکھنا صرف احسان ہی اور کچھ نہیں لیکن تفضل و احسان اُسی وقت تک تفضل ہے جب تک وہ کسی حیثیت سے خلاف تفضل نہ ہو احسان کا تقاضا صرف یہ ہی کہ بلوغ کے پہلے انسان کو گناہوں کی سزا سے مستثنیٰ قرار دیا جائے لیکن اگر وہ عبادت و طاعت کی حقیقت کا صحیح احساس رکھتے ہیں اور اُس کے برکات سے مستفید ہونا چاہتے ہیں تو اُنھیں ان

برکات سے محروم کرنا اور اس کے اجر و ثواب سے بے بہرہ رکھنا
بالکل تفضل و احسان کے خلاف ہے
بچوں کے مرفوع القلم ہونے کے نصوص ہرگز اس کو نہیں بتلاتے
بے شک اس صورت میں اگر ماں باپ ترغیب عبادت و اطاعت
کرتے ہیں اور اُن کی ترغیب و تحریص سے بچے میں جذبۂ طاعت و عمل
پیدا ہوتا ہے تو اس کے ثواب کا جس طرح بچہ کو بحیثیت عمل حاصل ہونے
کے استحقاق ہے اُسی طرح ان ماں باپ کو بحیثیت محرک عمل حاصل ہونا
چاہیئے جس طرح اگر کسی سمجھ دار اور سن رسیدہ شخص کو دعوت عبادت
و اطاعت دی جائے تو عامل کو ثواب عمل کا ہے اور محرک کو تحریک
عمل کا۔ اس کے معنے یہ ہوئے کہ واجبات کے وجوب سے بچے مستثنیٰ ہیں لیکن
استحباب کا درجہ اُن کے لیئے ثابت ہے اور اس لیئے مستحبات جو عام
اشخاص کے لیئے ہیں وہ بچوں کے لیے بھی ہیں۔ اور ان سے بچوں کے مستثنیٰ
ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

لڑکیوں کی تربیت کے خاص اصول

بچوں کی تعلیم و تربیت میں جس اصول کے ماتحت اُن کو عبادات و
اطاعات کی عادت ڈالنے کا حکم ہے اُس اصول پر لڑکیوں کی تربیت

میں کچھ باتوں پر خاص طور سے توجہ کرنے کی ضرورت ہے جو اُن کی اخلاقی اصلاح کے لیے انتہائی ضروری ہیں۔ لڑکیوں کو اُن کے آیندہ دور میں ایک خاص طرح کی زندگی بسر کرنا ہے اور شریعت اسلامی کے احکام کے ماتحت اُن کے لیے پردہ فرض و لازم ہوگا اس لیے اُن کو کمسنی کے زمانہ سے پردہ کی پابندی کے لیے تیار کیا جائے۔ اُن گھرانوں کا ذکر نہیں اور اُن افراد سے بحث نہیں جن کے یہاں اب عورتوں کے لیے پردہ کوئی چیز ہی نہیں رہا ہے مگر وہ شریف گھرانے جہاں اب بھی پردہ کی کوئی اہمیت باقی ہے اُن کو اس امر کا خیال رکھنے کی ضرورت ہے کہ لڑکیوں کو بچپنے کے دور میں اُس طرح آزاد نہ رکھا جائے۔ جس طرح لڑکے آزاد رہتے ہیں۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ لڑکیوں کو بلوغ کے زمانہ تک باہر نکلنے اور لڑکوں کے ساتھ کھیلنے کی اجازت رہتی ہے بلکہ کبھی شرعی سن بلوغ کا یعنی ۹ برس پورے بھی ہو جاتے ہیں مگر اُسے ابھی بچہ سمجھا جاتا ہے اور پردہ کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا ہے ان لوگوں کو یہ سمجھنا چاہیے کہ لڑکی ایک انسانی مخلوق ہے اور کمزور۔ اُس کی طبیعت میں متاثر ہونے کا کافی مادہ موجود ہے اگر بچپنے میں اُسے تفریح گاہوں میں جانے کا ذوق، باغات کی سیر کا شوق، اور تماشاگاہ عالم کے مناظر دیکھنے کا لطف حاصل ہو گیا تو

بلوغ یا بقول آپ کے جوانی کا زمانہ آتے ہی اُس کو ایک دم پابند بنانا اور پردہ کے اندر مقید کرنا اُس کی فطرت کے اوپر ایک ایسا زبردست دباؤ ہوگا جسے وہ مشکل سے برداشت کر سکے گی اگر واقعی آپ کو اُسے آیندہ زمانہ میں پردہ کرانا ہے تو اس کے لیے آپ کو پہلے سے اُس کی طبیعت کو عادی کرنا چاہئے۔ اس کی صورت یہی ہے کہ اُس وقت کا ذکر نہیں، جب اُس میں سمجھنے کی کچھ صلاحیت ہی نہیں ہوتی لیکن جب سے اُس میں امتیاز و شعور پیدا ہو اُسی وقت سے اُسے یہ احساس پیدا کرائیے کہ وہ "لڑکی" ہے۔ اور لڑکی کی طرح اُسے رہنا چاہئے اس میں ایک حکیمانہ تدریج قائم کرنا چاہئے اور جب وہ چھ سات برس کی ہو تو اُسے مکمل پردہ کا عادی بنا دینا چاہئے اس طرح نہیں کہ اُس کی طبیعت کے لئے یہ ناگوار ہو بلکہ اس طرح کہ وہ خود سمجھے کہ میرے لئے موزوں و مناسب یہی طریقہ ہے یوں سمجھیے کہ اُس کی طبیعت کو اس سانچہ میں ڈھالنا چاہیئے کہ اُسے ذوق ہی "سیر تماشا" کا پیدا نہ ہو۔ اجنبی لڑکوں کے ساتھ سمجھدار لڑکیوں کا کھیلنے دینا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ وہ بچپنے کے ساتھ کھیلنے ہی کا اُنس و محبت ایک وقت میں دوسری شکل اختیار کر سکتا ہے جس پر والدین کو شرمساری و پشیمانی کا موقع حاصل ہوگا۔

اکثر بچوں سے جو کہانیاں کہی جاتی ہیں اُن میں عشق و محبت کے تذکرے

ہوتے ہیں یہ چیز لڑکیوں کے لیے خاص طور سے مضر ہے۔
اُن سے جو کہانیاں کہی جاتی ہیں اُن میں اگر سچائی۔ دیانتداری، امانت وغیرہ کے سبق حاصل ہوتے ہوں تو بہت اچھا ہے اور نہیں تو کم سے کم ایسی باتیں تو نہ ہونا چاہیئے جو اُن کے دماغ کو نامناسب خیالات کا مرکز قرار دے سکتی ہیں۔ میں تو لڑکیوں سے ایسی کہانیاں کہنے کا بھی حامی نہیں ہوں جن میں عفت و پارسائی کا تذکرہ ہو۔ جیسے بادشاہ اور قاضی اور اُس کی زوجہ کی حکایت جو اکثر قدیم اخلاق کی کتابوں میں درج ہے اور شعرا نے اُسے نظم بھی کیا ہے کیونکہ اس طرح کے حکایات میں بھی صنفی تعلقات کی اس طرح یاددہانی ضرور موجود ہے جس سے میری رائے میں ابتدائے عمر میں لڑکیوں کو بالکل خالی الذہن ہی رہنا بہتر ہے، چہ جائیکہ وہ حکایتیں جن میں ناجائز تعلقات اور ہجر و وصل کے افسانوں کا بیان ہو۔
میری نظر میں لڑکیوں کی تربیت کا جو معیار ہے وہ تو اتنا دشوار ہے کہ غالباً موجودہ نظام معاشرت میں اُس پر عمل ہونا بالکل غیر ممکن ہے۔
لڑکی کے سامنے زیادہ شادی کا ذکر کرنا جیسے اکثر دلچسپی کے طور پر اُس کے گھونگھٹ نکال دیتے ہیں، کہتے ہیں لو دُلھن بیٹھی ہے یا اُس کو شرمانے کے لیے خواہ مخواہ اُس کے سامنے شادی کا نام لیتے ہیں، یہ چیزیں وہ ہیں جو اُس کے ذہن میں یہ تصور پیدا کرتی ہیں کہ شادی ایک خاص

چیز ہے جس میں کچھ مخصوص لطف مضمر ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ
اس وقت کا انتظار کرنے لگتی ہی اور اس کے بعد اگر اس میں تاخیر
ہونے لگتی ہی تو اس کا نتیجہ کچھ اچھا نہیں ہو سکتا۔

ایک صاف سادہ مخلوق جس میں تشنگی موجود نہیں، اُسے صرف
خوش آیند تذکروں سے تشنہ بنایا جاتا ہی، پھر جس وقت اُس کو سچی
پیاس ہوگی تو آپ اُس کے حصول مقصد میں تاخیر بھی کریں گے۔
یقیناً اس میں جو کچھ بھی بُرے نتائج پیدا ہو جائیں وہ کم ہیں۔

بعض چیزیں ایسی ہیں کہ جن سے بالواسطہ شادی کی آرزو کا استحکام
ہوتا ہے حالانکہ اُن کے قرار دینے کا مقصد نیک تھا مگر طریقہ حصول
اس کا میرے نزدیک اچھا نہیں اختیار کیا گیا۔

اکثر گھرانوں میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو غیر شادی شدہ
لڑکیوں کے لیئے ممنوع ہیں۔ جیسے مسی لگانا، اُلٹے بال بنانا۔ عطر
لگانا، ہار پھول پہننا۔ پائنچے دار پائیجامہ پہننا وغیرہ وغیرہ۔ جب لڑکی
ان باتوں کا ارادہ کرتی ہے تو اُسے یہ کہکر روک دیا جاتا ہے
کہ تمھاری شادی نہین ہوئی ہے۔ تم کو یہ باتیں نہیں کرنا چاہئیں
اس کا نتیجہ ہی کہ لڑکی کو شادی کی حسرت پیدا ہو جاتی ہے۔ نہ یہ کہ
وہ شادی کی اصل حقیقت سے واقف ہے بلکہ اس لیئے کہ شادی ہو

تو ہمیں بھی یہ آرائش کرنے کی اجازت ملے ۔ میں نے کہا کہ اس رسم کا مقصد نیک تھا ، درحقیقت اس رسم کی بنیاد اس خیال پر تھی کہ آرائش حسن خود طالب اظہار ہے ۔ اگر لڑکی آراستہ و پیراستہ ہوگی تو خودبخود اُس کے ذہن میں اس قسم کا خیال پیدا ہوگا کہ اس کا دیکھنے والا ہونا چاہیئے لیکن اگر وہ کچی کچی رہے آرائش سے علحدہ رہے تو اُس کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہی نہیں ہوگا لیکن اس مقصد کے لیئے ضرورت تھی ایسے طریقوں کی کہ لڑکی کے دل میں شوق آرائش پیدا ہی نہ ہو اصُول تربیت کے تحت میں اس کا صحیح طریقہ یہ تھا کہ جب سے لڑکی ذرا سمجھدار ہو تو اُس کی ماں بڑی بہنیں اور دوسری بزرگ عورتیں جو گھر میں رہتی ہوں وہ خود اپنی آرائش کو کم کردیں، تاکہ لڑکی بھی اسی ماحول میں پرورش پائے یہ نہیں کہ جب کسی تقریب میں جانے لگے تو جتنی گھر کی عورتیں ہیں سب نے بہترین طریقہ سے اپنے تئیں آراستہ کیا اور رونق حسن کے جتنے اسباب ہیں سب مہیا کرلیئے صرف ایک یہ "گنہگار" بن بیاہی لڑکی رہ گئی جو سب سے علحدہ وضع رکھتی ہے ۔ یہ چاہتی ہے کہ اُسی طرح یہ بھی آراستہ ہو تو یہ کہدیا جاتا ہے کہ نہیں ۔ خبردار تمھاری ابھی شادی نہیں ہوئی ہے ۔ تم کو حق نہیں اب نہ پوچھیئے کہ اُس کے دل پر کیا گزرے گی اور اُسے کس طرح اپنی دوسری ساتھی عورتوں

پرورشک آئیگا اور اس طرح یہ خواہ مخواہ شادی کے وقت کی منتظر بن جائے گی۔

یہ کچھ بُرا نہ تھا اگر آپ اس معاملہ میں شرع کے حکم پر چلتے کہ وہاں یہ حکم ہے کہ لڑکی کی شادی بہت جلدی کرو۔ یہاں تک کہ اگر اُس کا بلوغ ہی شوہر کے گھر میں ہو تو بہت اچھا ہے مگر یہاں تو لڑکیاں اکثر بیس پچیس۲۵ برس تک بٹھا رکھی جاتی ہیں اس لیئے کہ آپ کی طبیعت کے مطابق شوہر نہیں ملتا اور اکثر لڑکیوں کی "بہار زندگی" اسی طرح "خزاں" ہوجاتی ہے اور وہ حقیقی طور پر زندہ درگور ہوجاتی ہیں۔ اس طرز عمل کے ساتھ پھر وہ طریقۂ تربیت تو انتہائی مہلک اور ضرر رساں ہے۔ اور کیا معلوم کہ جو ناگوار واقعات پیش آتے ہیں اُن میں کہاں کہاں والدین ہی کا طرز عمل سبب ہوتا ہے جو خراب صورتیں پیش آتی ہیں۔

زمانۂ بلوغ

—— ٭(یا)٭ ——

انسانی ذمہ داری کا ہنگام

بچہ کی صحیح تعلیم و تربیت ہو چکی، اُسے ضروری تعلیم دیدی گئی

اُس کے اخلاق کی اصلاح کی گئی، اُس کو عبادت و اطاعت کا ذوق و شوق پیدا کیا گیا اور لڑکیوں کو مناسب طریقہ پر اُن کے آئین زندگی کا پابند بنا دیا گیا مگر ابھی تک نابالغی کا زمانہ ہے۔ اس وقت میں ایک طرف وہ تکالیف سے مستثنیٰ ہیں یعنی گناہ اُن کے نامۂ عمل میں نہیں لکھے جاتے اگر یہ ثواب کے متعلق میں نے کہا کہ اگر اُن میں خود ذوق عبادت و اطاعت پیدا ہو گیا ہے تو انھیں استحقاق حاصل ہے۔ ثواب و عذاب کے مسئلہ میں اس تفریق کا مجھے ایک شاہد احادیث میں بھی مل گیا۔ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں ان اولاد المسلمین موسومون عند اللہ شافع مشفع فاذا بلغوا اثنتی عشرۃ سنۃ کتبت لھم الحسنات فاذا بلغوا الحلم کتبت علیھم السیٔات "مسلمانوں کی اولاد خدا کے یہاں نامزد ہے۔ وہ اپنے والدین کی شفاعت کرنے والے ہیں اور وہ شفیع قرار دیئے گئے ہیں اس کے بعد جب ۱۲ برس کی عمر ہو تو اُن کے لیے نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور جب بالغ ہوں تو گناہ لکھے جاتے ہیں"۔ اس میں جو عمر مقرر کی گئی ہے وہ ویسی ہی جیسے تعلیم و تادیب کے لئے سات برس کی جس کو میں نے کہا کہ یقینی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ ایک تخمینہ ہے اسی طرح یہ زمانہ مطلب یہ ہے کہ شروع میں چھ سات برس کے سن میں جب کہ تعلیم و تربیت اور عبادتوں کی عادت ڈالنے کا حکم ہوا اُس وقت اُن میں زیادہ تر وہ

خیالات دماغ میں راسخ نہیں ہوتے اور نہ اُن کا عقل وشعور اور علم ومعرفت اتنا ہوتا ہے کہ وہ عبادت کو عبادت سمجھ کے بجا لائیں اس لیے جس طرح گناہ اُن پر نہیں ہیں، اسی طرح ثواب بھی اُن کے لیے نہیں ہے۔ لیکن اس کے بعد کچھ مدت میں وہ زمانہ آجاتا ہے جب وہ عبادت کو بطور عبادت بجا لا سکتے ہیں یہ ابتدائے تعلیم کے سن یعنی چھ یا سات برس کی عمر اور وقت بلوغ یعنی پندرہ برس کے درمیان کی ایک منزل ہے۔ اس لیے اس کے لئے ۱۲ برس کی عمر تخمینہ کے طور پر بتلائی گئی۔

اس زمانۂ نابالغی میں جس طرح واجبات ومحرمات کی ذمہ داری سے وہ سبکدوش ہیں۔ اس لیے کہ اُن کی عقل ابھی کامل نہیں ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ اُن کے اموال اور ملکیتوں میں اُن کے تصرفات بھی نافذ نہیں ہیں۔ ملکیت کا حصول تو بلوغ پر موقوف نہیں ہے شیر خوار بچہ، بلکہ جب وہ حمل کی حالت میں تھا اُس کے لیے بھی ملکیت کا حصول ممکن تھا مثلاً اگر کوئی اُس کا عزیز قریب مرجائے جس کی میراث کا اُسے حق حاصل ہے تو اُس کا حصہ الگ کیا جائے گا۔ جب وہ زندہ پیدا ہو تو اُس کے لیے وہ میراث قرار دی جائے گی مگر تصرف املاک میں اُس وقت تک صحیح نہیں جب تک حد بلوغ تک نہ پہونچ جائیں۔ یہ بھی اُن ہی کے مفاد کی خاطر ہے اس لیے کہ ناسمجھی اور بھولے پن سے نہ معلوم کون سا ایسا تصرف کردیں جو

اُن کے حق میں مضر ہے جس پر کہ بعد میں اُنھیں دست تاسف ملنا پڑے ،
علاوہ مالی تصرفات کے دوسرے اُن کے معاملات جیسے نکاح وغیرہ بھی
معتبر نہین قرار دیئے گیۓ بے شک ان تمام باتون کے لیے اُن کے واسطے
ولی مقرر کردیئے گئے وہ جو عام اصول فطرت کی بنا پر ان کے مفاد کی نگہداشت
خود اُن سے زیادہ کرسکتے ہیں۔ یعنی باپ اور دادا ، اس بارے میں ان
کو تو یہ تاکید ہے کہ وہ بچہ کے مفاد کا خیال رکھیں ۔ مگر اُن کو اس معاملہ
میں اُن کی عظمت کا لحاظ کرتے ہوئے ایک طرح کی حکومت دی گئی ہی یعنی وہ
اپنی صوابدید سے جو کام اس بچہ کے لیے کردین اُس کے منسوخ کرنے کا اس
کو بلوغ کے بعد بھی حق نہین ہی ان دونوں میں سے ہر ایک مستقل طور پر
ولی ہی اگر دونون موجود ہیں اور ایسا اتفاق ہو کہ دونون متضاد تصرف
واقع کرین ۔ مثلاً ایک نے اس کی کسی املاک کو ایک کے ہاتھ فروخت
کیا اور نا واقفیت کی وجہ سے دوسرے نے کسی اور کے ہاتھ تو جس کا
تصرف پہلے واقع ہوا ہو وہ نافذ سمجھا جائے گا ، دوسرا تصرف بیکار ثابت
ہوگا اور اگر اتفاقی طور پر ایک ساتھ یہ تصرفات ہوں تو دادا کا حکم باپ
پر مقدم ہی کیونکہ وہ اس کے لیے بھی واجب الاطاعت ہی ۔
بے شک طلاق کا مسئلہ اس درجہ شریعت نے نازک قرار دیا ہے کہ
اُس کا حق شوہر کے سوا اور کسی کو نہیں ہے ۔ الطلاق بید من اخذ بالساق

"طلاق اسی کا ہاتھ میں ہے کہ جو ہاتھ پکڑے گا" اس لیے باپ دادا بھی اپنی ولایت سے اگر بچہ کا عقد کردیں تو پھر وہ اُسے طلاق نہیں دے سکیں گے نابالغی کے زمانہ ہی میں باپ کے اُٹھ جانے سے انسان یتیم ہوتا ہے۔ بلوغ کے بعد یتیمی کی حدیں ختم ہوجاتی ہیں اور پھر اُسے یتیم نہیں کہا جاسکتا۔

بلوغ کے لیے شرع نے دو حیثیتوں سے حد مقرر کی ہے۔ ایک عمر کے لحاظ سے یعنی لڑکے کو پندرہ ۱۵ برس پورے ہوجائیں اور لڑکی کو ۹ برس دوسرے حالات کے لحاظ سے مثلاً مرد اور عورت دونوں میں وہ صورتیں پیدا ہونا جن سے غسل واجب ہوتا ہے۔

یہ قابل غور بات ہے کہ بلوغ حکم شرعی ہے جس کا نتیجہ ہے تکالیف شرعیہ کا متوجہ ہو جانا۔ اور تصرفات کا نافذ ہونا اور یتیمی کا ختم ہونا اس لیے کہ "احکام شرعیہ" وجوب حرمت، استحباب، کراہت، اباحت ہی کو نہیں کہتے، یہ تو "احکام تکلیفیہ" ہیں ان کے علاوہ شرعی احکام بہت ہیں جیسے طہارت نجاست، زوجیت، ملکیت، حریت وغیرہ وغیرہ۔ ان کو احکام وضعیہ کہتے ہیں۔ یہ بھی شرع ہی کی طرف سے مقرر ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہا جائے کہ بلوغ بھی اسی طرح کا ایک حکم شرعی ہے۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ اس کا اختیار بالکل شرع کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جس چیز کو چاہے اس حکم کا محل قرار دے سکتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ

وہ ایک امر واقعی ہے جس پر شرع کی طرف سے احکام مرتب ہوئے ہیں۔ اور اُن حالات کا پیدا ہونا اُس کے حصول کی علامت ہے۔ اس وقت میں یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ شرع کی جانب سے اس کے لیے دو حدین مقرر کیا جانا کیونکر درست ہیں جبکہ وہ دونون بالکل لازم اور ملزوم نہین ہیں بلکہ ایک دوسرے سے جُدا بھی ہوجاتی ہیں اس کے علاوہ آب وہوا مزاج وغیرہ کے اعتبار سے بچہ کے خصوصیات مختلف ہوتے ہیں، کسی میں چودہ (۱۴) برس کے سن میں وہ حالت پیدا ہوجاتی ہے جو دوسرے میں پندرہ (۱۵) برس کے سن میں ہوتی ہے اور کسی میں سولہ (۱۶) برس کی عمر تک بھی یہ حالت نہین ہوتی اس صورت میں شارع کی جانب سے سب کے لیے ایک عمر مقرر ہوجانا کہاں تک درست ہے۔

اس کا جواب میں اس طرح پیش کرون گا کہ کوئی حکم جو دیا جاتا ہے اُس کی دو صورتین ہوسکتی ہیں ایک یہ کہ کوئی شخص خاص مخاطب ہو اور اُس کے خصوصی حالات کی بنا پر اُس کے ذمہ کوئی فرض عائد کیا جائے ظاہر ہے کہ اس صورت میں تو اُس کے خصوصیات اور انفرادی حالات اُس حکم کا معیار رہیں گے اور وہ بالکل معین حیثیت رکھتے ہون گے اسی طرح اگر چند اشخاص کی جانب حکم متوجہ کیا جائے مگر ان کی انفرادی خصوصیتوں کے لحاظ کے ساتھ، یقیناً اس صورت میں لازمی ہے کہ اگر اُن کے حالات

یکساں ہوں تو ایک حکم سب کے لیے جاری کیا جائے اور اگر حالات ان کے مختلف ہوں تو ہر ایک کے لیے اُس کے لحاظ سے حکم ہو اور سب کے حکم جدا جدا ہوں لیکن دوسری صورت یہ ہے کہ ایک عام قانون نافذ کرنا مقصود ہے جس میں افراد و اشخاص کی خصوصیت کا کوئی سوال ہی نہیں ہے اس صورت میں اگر ان کے حالات باہم اختلاف رکھتے ہیں تو ان سب کی اجتماعی حیثیت کو سامنے رکھ کر ایک غالبی معیار یا اوسط نکالا جائے گا۔ اور اُس کے مطابق حکم نافذ کیا جائے گا اس میں پھر یہ سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا کہ کسی فرد میں یہ صورت پہلے ہو جاتی ہے اور کسی میں بعد۔ مثال کے طور پر گورنمنٹ کی جانب سے زمینداریوں وغیرہ کے تعلیقہ میں بائیس برس کی عمر معین کی گئی ہے ظاہر ہے کہ اس کے لیے کوئی نہ کوئی معیار اور اصول پیش نظر ضرور تھا۔ یعنی ۲۲ کی تعداد سے کوئی خاص محبت نہیں تھی نہ اس عدد سے کوئی برکت حاصل کرنا مقصود تھی۔ مگر یہ یقینی ہے کہ وہ معیار وہ اصول ہر ایک شخص کے لیئے ٹھیک ٹھیک بائیس ہی برس میں حاصل نہیں ہوتا ہے بلکہ کسی کے لیے پہلے ہوتا ہے۔ کسی کے لیے بعد۔ لیکن پھر بھی قانونی حیثیت سے عموم پیدا کرنے کے لیے ایک عمر کا سب کے لیے معین کرنا ضروری سمجھا گیا۔ اسی طرح ساردا ایکٹ میں شادی کے لیے جو ۱۴۔ اور ۱۸ برس کی عمر معین کی گئی ہے وہ چاہے ہمارے نزدیک غلط ہو لیکن پھر بھی

کسی نہ کسی مفروضہ معیار کی بناء پر رکھی گئی ہے۔ وہ معیار یقیناً اتنی ہی عمر پر بالکل منطبق نہیں ہے مگر قانون کا انداز ہی یہ ہوتا ہے کہ اس میں انفرادی اختلافات اثر انداز نہ ہو سکیں۔

اب ملاحظہ کیجئے کہ وہ حالات جو اصل میں علامات بلوغ مقرر کیے گئے تھیا چونکہ باطنی چیزیں ہیں اور اکثر ایسے ہیں کہ جب تک خود انسان اُن کا اظہار نہ کرے اُس وقت تک اُن کا علم ممکن نہیں، اگر ان ہی کو معیار بلوغ قرار دیا جاتا تو بسا اوقات اس میں اشتباہ واقع ہوتا نیز اکثر عوارض کی بناء پر وہ حالات پیدا نہیں ہوتے یا بہت زیادہ عمر میں پیدا ہوتے ہیں اس لیے ضرورت تھی کہ اُن کے علاوہ بھی کوئی معیار مقرر کیا جائے جس کا سمجھنا آسان ہو۔ اُس کے لیے عمر قرار دی گئی اب اگر اُن دوسرے حالات کا علم اس عمر کے پہلے ہی ہو جائے تو وہی ثبوت بلوغ کے لیے کافی ہوں گے اور اگر یہ عمر حاصل ہو گئی تو چاہے وہ حالات پیدا ہوں یا نہ ہوں بلوغ شرعی حاصل ہو جائیگا اور احکام بلوغ مترتب ہونگے

بلوغ کے بعد کی اہم ذمہ داریاں

حد بلوغ تک پہونچنے کے بعد انسان کی ذمہ داریاں بہت ہیں جن کو دو شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے (ایک) اصول عقائد (دوسرے) عملی فرائض۔ اس دوسرے شعبہ میں پھر دو قسمیں ہیں ایک حقوق اللہ یعنی انسان کے انفرادی فرائض دوسرے حقوق الناس یعنی اجتماعی فرائض ان پر ترتیب کے ساتھ روشنی ڈالی جاتی ہے۔

نظامِ زندگی میں مذہب کی اہمیت

انسانی زندگی میں عقائد کو بڑی اہمیت حاصل ہے مذہب ہی وہ ہے جو دنیا میں امن و امان کا سبب ہو سکتا ہے اور مختلف جماعتوں میں حقوق و حدود کی تعیین کرتا ہے۔

بات یہ ہے کہ ہر انسان بلندی و تفوق کا طالب ہی اور اپنی خواہشوں کو حاصل کرنا چاہتا ہے اور ہر انسان کی خواہشیں ہیں لامحدود یہاں تک کہ اگر ایک انسان کو تمام دنیا بھی مل جائے تو وہ آرزو مند ہوگا کہ ایک دنیا دوسری ہو جسے وہ اپنے قبضہ میں لائے مگر دنیا اور اُس کے منافع ہیں محدود اس لیے اگر ایک انسان کو سب کچھ وہ دے دیا جائے کہ جس کا وہ طالب ہے تو دوسرے سب کو محروم ہونا پڑے گا اور اگر سب کو اُن کی لامحدود خواہشوں کے حاصل کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے تو تصادم ہوگا اور قوتوں کا تقابل ہوگا جس میں ہر طاقتور کمزور کو فنا کردینے کی کوشش کریگا پھر اگر یہ قوت اور کمزوری کوئی مستقل اور دائمی حیثیت رکھتی ہوتی تو اچھا ہوتا کہ ایک دفعہ مقابلہ ہو کر فیصلہ ہو جاتا۔ جو طاقتور ہوتا وہ زندہ رہتا اور جو کمزور ہوتا وہ فنا ہو جاتا مگر یہ دنیا کی طاقت و قوت اور کمزوری ہوا کے جھونکوں اور جھولے کے پینگوں کی طرح

منتقل ہوتی رہتی ہے۔ ایک وقت جو طاقتور ہے وہ دوسرے وقت کمزور اور ایک وقت جو کمزور ہے وہ دوسرے وقت طاقتور ہوتا ہے اب جس شخص نے اپنی قوت کے موقع پر دوسرے کمزور پر زیادتی کی وہ اُس کمزور کے دل میں رہ جاتی ہے اور وہ موقع کا منتظر رہتا ہے جب اُس کو طاقت حاصل ہوتی ہے تو وہ اُس کا بدلا لیتا ہے۔

مثال کے طور پر ایک توانا و تندرست جوان اپنے راستے میں ایک کمزور اور ناتوان بچے کو دیکھتا اور اُسے دھکا دے کر ہٹا دیتا ہے۔

یہ اس وقت ایک بالکل معمولی چیز تھی اور اس کے لیے آسان مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ ایک وقت میں یہ جوان بوڑھا ہوگا اور وہ بچہ جوان ہوگا، اگر اُس نے یہ احساس دل میں قائم رکھا کہ میری کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر اِس شخص نے مجھ پر زیادتی کی تھی تو وہ اپنی قوت کے دور میں اس شخص سے بدلا لینے کی کوشش کرے گا اب ممکن ہے کہ وہ بوڑھا آدمی چیخے چلائے اور فریاد بھی کرے کہ میں مظلوم ہوں یہ جوان آدمی مجھے مارے ڈالتا ہے اور ناواقف یا سادہ لوح افراد اس سے متاثر بھی ہوں مگر حقیقت میں یہ اس کی مظلومیت ایک وقت کے ظالم ہونے کا نتیجہ ہے دنیا میں اس طرح کی مثالیں پیش ہوتی رہتی ہیں جس وقت حالات آپ کے سازگار رہے اور طاقت آپ کے ساتھ تو دشمن کو کمزور

پاکر آپ نے معاہدہ کے شکنجے میں اُس کو اسیر کر کے اُس کے مقبوضات مال لاوارث کی طرح اپنے دوستوں پر تقسیم کر دیئے، لیکن جب دشمن نے آ کی مہلت پاکر اپنی طاقت کو بڑھا کر اپنے سابقہ مقبوضات کا مطالبہ کرتا ہے اور ممکن ہی کہ اس کے ساتھ جذبۂ انتقام کی بنا پر اپنے حریفوں کے اوپر کچھ زیادتی بھی کر رہا ہو۔ تو آپ فریاد کرتے ہیں کہ ہم پر ظلم ہو رہا ہے ہم مظلوم ہیں اور ہمدردی کے مستحق ہیں اور دنیا بھی کہتی ہی کہ ہاں بیشک مظلوم ہیں۔

بات یہ ہی کہ انسان حال کو دیکھتا ہی اور وہی اُس کے دل و دماغ پر اثر ڈالتا ہے اور ماضی و مستقبل چونکہ نگاہ سے اوجھل ہیں اس لیے اُن کا خیر پڑتا نہیں۔

اس وقت جس کی زیادتی ہوگی دنیا کے زود فراموش افراد اُسی کو کہیں گے کہ ظالم ہے۔ حالانکہ یہ دیکھنا ضروری ہی کہ اس ظلم کے اسباب کیا ہیں۔ پھر اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے انداز مختلف ہوتے ہیں کوئی تو شمشیر برہنہ ہو کر سامنے آ جاتا ہی اور کوئی "دشنہ زیرِ آستین پنہاں" کیئے ہوئے اپنے حریفوں کے سامنے آتا ہے۔ بہر حال مختلف جماعتوں کی خود غرضی اور تفوق و برتری کی خواہش اور اپنے حقوق کا مطالبہ ہمیشہ تصادم اور کشمکش کا باعث رہا ہی اور رہے گا کیونکہ انسانی خیال

کے مطابق اُس کے حقوق بھی اُس کی تمناؤں کے ساتھ وابستہ ہیں جو جس کی آرزو ہے اُسی کو وہ اپنا حق سمجھتا ہے اور اُس کی تکمیل کا خواہشمند ہوتا ہے۔ اس معیار کے مطابق سب کو اُن کے حقوق ملنا اور سب کو پوری آزادی ہو جانا غیر ممکن ہے۔ اب ایک صورت یہ ہے کہ ایک کو مکمل آزادی دیدی جائے اور دوسروں کو سب کو مقید کر دیا جائے مگر یہ وہی کر سکتا ہے جس کو اُس ایک کے ساتھ کوئی جانبداری اور رشتہ داری ہو، بہرحال عقل و انصاف کی بارگاہ میں یہ صورت قابل قبول نہیں، دوسری صورت یہ ہے کہ سب کو حصہ رسدی آزادی کی تقسیم ہو اور سب کے حقوق کی کسی بالادست طاقت کی طرف سے تعیین ہو جس کی وجہ سے تصادم کا امکان جاتا رہے مگر یہ تقسیم اور تعیین کرے کون۔ کیونکہ دنیا میں مختلف حیثیتوں سے تفریق قائم ہے اور کوئی شخص بھی ہو اُسے کسی ایک فرد یا جماعت سے زیادہ تعلق اور دوسروں سے کم تعلق ہونا یقینی ہے اور اس لحاظ سے جانبداری کا امکان ہے ادھر تمام جماعتوں کے ضروریات و حقوق سے یکساں طور پر کسی کا باخبر ہونا بھی ممکن نہیں ہے اس لیے ضرورت ہے کہ حدود اور حقوق کی تعیین کرنے والی ایک ایسی ہستی ہو جس کو تمام افراد بشر کے ساتھ یکسان تعلق ہو اسی کی طرف سے عائد کردہ قانون سب کے لیے یکسان طور پر قابل عمل ہو سکتا ہے اور وہی قانون کہ جو سب کے لیے حدود آزادی کی تعیین کردے، اُس کا نام مذہب ہے اور اُس کا نافذ کرنیوالا

خدا ہے جس کو تمام کائنات کے ساتھ یکساں تعلق حاصل ہے۔

مذہب ضمیر اور دل پر حکمران ہوتا ہے، اور چونکہ دل کی سلطنت تمام اعضائے جسم انسانی پر ہے اس لیے تمام انسان کے افعال و اعمال قیود و حدود کے تحت میں انجام پاتے ہیں۔

مذہب سے قطع نظر کرکے ہم کسی طاقتور سے اس مطالبہ کا حق نہیں رکھتے کہ وہ اپنی طاقت سے فائدہ نہ اُٹھائے کیونکہ دنیا کی ہر چیز فائدہ اُٹھانے کے لیے ہے اور فائدہ جو کچھ ہے وہ یہی دنیا کا وقتی فائدہ ایک شخص جس کے بازؤں میں قوت ہے، تلوار میں باڑھ ہے، مد مقابل کمزور ہے اور اُس کی پامالی سے ایک بہت بڑے نفع کی امید ہے کس سہارے پر اپنا ہاتھ روکے اور کس امید پہ اپنے مقصد کے حاصل کرنے سے باز آئے۔

مگر مذہب وہ ہے جو انسان کے جذبہ اقتدار اور غرور فوقیت کو شکست دیتا ہے، وہ انسان کی نگاہ کو بلند کرتا ہے۔ اور اس وقتی و عارضی مفاد کے آگے ایک کامیابی و ناکامی کا تصور پیدا کرتا ہے اور اُسی کے سہارے پر ایک طاقتور انسان طاقت کے ناجائز استعمال سے باز رہتا ہے اور کمزور اور ناتوان اشخاص کو سانس لینے کا موقع مل سکتا ہے

مذہب دنیا میں امن و امان اور نظام اجتماعی کے برقرار رہنے

کا واحد ذمہ دار ہے۔

یہ اور بات ہی کہ دنیا میں مذہب ہی کے نام پر فتنہ و فساد برپا ہو اور جنگ و جدال قائم ہو مگر مذہب اس کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا نہ اس کی وجہ سے مذہب فنا کیئے جانے کے قابل ہی۔ یہ اپنی نگاہ کا قصور ہوگا کہ انسان نقل اور اصل میں تمیز نہ کر سکے انسان اگر امی ٹیشن سے دھوکا کھائے تو یاقوت کو بُرا نہ کہے بلکہ اپنی نگاہ کی کمزوری کا اقرار کرے۔ اگر ملمع کو اصلی سونا خیال کرے تو سونے کا قصور نہ سمجھے بلکہ اپنی شناخت کی کوتاہی خیال کرے یوں ہی اگر مذہب کے نام سے کسی دام فریب میں مبتلا ہو جائے تو مذہب کا شکوہ نہ کرے اپنی نگاہ و غلط اندازی کی کوتاہی کا احساس کرے۔

انسان کو چاہیئے کہ سوچے سمجھے اور غور کرے۔ دیکھے کون مذہب حق ہے اور کون باطل، کون آواز جو مذہب کے نام سے بلند کی گئی حقیقت پر مبنی ہی اور کون جعلسازی مکاری اور ابلہ فریبی پر،

اسی لیے مذہب کی تحقیقات کا دروازہ ہر شخص کے لیئے کھلا رکھا گیا ہے اور کسی کے لیے صرف باپ دادا کے راستے کی پابندی اور اُن کے اختیار کیئے ہوئے مسلک کی لاج کو ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کے لیے کافی نہیں سمجھا گیا ہے۔

اسلامی عقائد کا اثر

افعال و اعمال پر

انسان کے افعال و اعمال اُس کی ذہنیت کے ماتحت ہوتے ہیں اور ذہنیت کی تشکیل عقائد و خیالات سے۔ اسلام نے جن عقائد کی تلقین کی ہے وہ سب ایسے ہیں کہ جو انسان کو بلند نگاہ بنانے والے ہیں اور اُس کے افعال و اعمال میں بلندی و شائستگی پیدا کرنے کے باعث ہیں۔

توحید

سب سے پہلا تحفہ جو مذہب کی طرف سے عالم انسانیت کے لیے پیش ہوا ہے وہ خدائے واحد کا اقرار ہے۔ اس کی وجہ سے تمام افراد انسانی ایک رنگ میں رنگ جاتے ہیں اور ایک کیفیت میں سمو جاتے ہیں۔

انسانی جماعت میں مختلف حیثیتوں سے تفرقہ ہے اور اس لیے ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ان میں آپس میں محبت نہیں ہوتی اس لیے کہ کسی چیز میں وہ اپنے کو دوسرے کے ساتھ متحد نہیں خیال کرتے لیکن اگر یہ احساس پیدا ہو جائے کہ ہم سب ایک خدا کے بندے ہیں تو سب ایک دوسرے کے ساتھ یگانگی اور اتحاد کا احساس کرنے لگیں دنیا میں طاقتور کمزور پر اس لیے ہاتھ اُٹھاتا ہے کہ اپنے سے بالاتر

کوئی قوت نہیں سمجھتا اور کمزور اس لیے شکستہ دل ہو جاتا ہے کہ اپنی پشت پر کسی کو مددگار نہیں دیکھتا۔

خدائے واحد کا عقیدہ طاقتور کے سر غرور کو جھکاتا ہے اور اُس کے دل میں ایک غیبی طاقت کا اندیشہ پیدا کرتا ہے اور کمزور کی نگاہ کو اٹھاتا ہے اور اُس کے دل میں امید کی لہر پیدا کرتا ہے۔

اس کا نتیجہ ہے کہ مختلف طاقتوں میں توازن قائم ہوتا ہے اور زندگی کی کشمکش میں کمزور بھی طاقتور کے ساتھ جدوجہد کے قدم اٹھاتا ہے مضطرب دل کے لیے سکون، ٹوٹے ہوئے دل کا آسرا۔ مایوسیوں کے عالم میں دلاسا اگر ملتا ہے تو خدائے واحد پر ایمان سے۔ مادہ پرست انسان کی زندگی ایک ایسی کشتی ہے جس کا کوئی ساحل نہیں مگر خدا پرست انسان کی کشتی کتنی ہی طوفانی ہو اور تھپیڑوں میں کروٹیں لے رہی ہو مگر پھر بھی وہ پُر امید ہے اس لیے کہ اس کشتی کا ایک ساحل ہے اور اُس کا ایک ناخدا ہے اور وہ پردۂ غیب کا پوشیدہ خدا ہے۔

علمِ خدا

فلاسفہ اور حکماء نے خدا کے علم کو کلیات کے ساتھ محدود قرار دیا ہے اس لیے کہ جزئیات متغیر ہیں، ان کے علم سے خدا کی ذات

میں تغیر لازم آئے گا۔ یہ استدلال غلط ہے۔ معلومات کے تغیر سے علم میں تغیر ضروری نہیں ہے اور اس لیے ذات الٰہی میں بھی تغیر لازم نہیں آتا۔ بہر حال مذہب حق کی تعلیم اس سے جداگانہ ہے۔

مذہب کہتا ہے کہ خدا کو ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کا علم ہے۔ امیر المومنینؑ نے نہج البلاغہ میں اس کو جس طرح بیان کیا ہے وہ ایک ایسا انداز ہے جو دماغوں میں اس حقیقت کو بالکل جاگزیں کر دیتا ہے۔ حقیقت میں تو یہ ایک جملہ ہے کہ "خدا ہر بات سے واقف ہے" مگر اس کا دل و دماغ پر وہ اثر نہیں پڑتا جو تجزیہ و تحلیل کے ساتھ معمولی اور انتہائی چھوٹی چیزوں کی تفصیل کے بیان کے ساتھ پڑتا ہے۔

"ید الائمہ کے تعلیمات" رسالہ میں جو امامیہ مشن سے شائع ہوا ہے امیر المومنینؑ کے وہ اقوال نقل کیے گئے ہیں۔ خداوندی علم و اطلاع کی اس وسعت کے احساس سے انسان کی عملی زندگی پر بہت بڑا اثر پڑتا ہے۔ غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ گناہ کے لیے انسان کو فطرتاً ایک خواہش "تنہائی" ہوتی ہے۔ انسان معمولی معمولی آدمیوں سے چھپتا پھرتا ہے کہ گناہ کرتے اس کو دیکھ نہ لیں وہ تذکرہ سن لیتا ہے اپنے جرم کا تو دل دھک سے ہو جاتا ہے اور چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں۔ یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جنھیں احساس گناہ باقی ہو اور گناہ کو فخریہ انداز

پرہیز کرتے ہوں خصوصاً ایک انسان اُس شخص سے تو بہت زیادہ خفار کی کوشش کرتا ہے کہ جس کا جرم ہو۔ کسی کو ہم بُرا کہہ رہے ہوں اور وہ آتا ہوا نظر آئے فوراً زبان کو روک لیں گے خاموش ہو جائیں گے اس غرض سے کہ اُس کو اطلاع نہ ہو، شرط یہ ہے کہ اُس شخص کا کچھ بھی لحاظ عظمت اور عزت نگاہ میں ہو پھر جب معمولی اشخاص کا یہ حال ہو تو اگر کسی کو یقین ہو اس کا کہ خدا اُس کے اعمال کا حاضر و ناظر ہے۔ ہر وقت وہ اس کے افعال کا نگراں ہے۔ اور اس کی قدا ذرا سی بات کا اس کو علم ہے تو کیا ممکن بھی ہے کہ انسان کسی گناہ کا ارتکاب کرے۔

اسی بنا پر خداوند عالم نے اپنے علم کا تذکرہ قرآن میں اکثر افعال خلق ہی کے لحاظ سے کیا ہے۔ مثلاً ان اللہ بصیر بما یعملون۔ ان اللہ بما تعملون بصیر۔ ان اللہ خبیر بما یصنعون۔ ان اللہ علیم بما تفعلون وغیرہ وغیرہ۔ اور انسان کی خواہش اخفار کو دکھلاتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔ یستخفون من الناس ولا یستخفون من اللہ وھو معھم اذ یبیتون ما لا یرضیٰ من القول وکان اللہ بما یعملون محیطا "یہ لوگ آدمیوں سے چھپتے پھرتے ہیں اور اللہ سے نہیں چھپتے حالانکہ وہ اُن کے ساتھ ہوتا ہے جبکہ وہ راتوں کو ایسے مشورے کرتے ہیں جو خدا کو ناپسند ہیں اور خدا اُن کے اعمال سے پورے طور پر باخبر ہے"

دنیا کے ہر شعبہ میں مکر فریب خیانت دغابازی ایذا رسانی۔
چوری، فسق فجور۔ بدکاری سب نتیجہ ہے اس کا کہ انسان خدا کو
اپنے دل سے واقعی طور پر حاضر و ناظر نہیں سمجھتا۔ دنیا والون کے
یہ ذہن نشین ہو جائے کہ خدا حاضر و ناظر ہے تو دنیا امن و امان کا
گہوارہ بن جائے اور ہر قسم کی بداعمالیون کا سدباب ہو جائے۔

حکمت و عدالت

"خداوند عالم" کے افعال کیسے ہو سکتے ہیں، اس جگہ ایک طبقہ
کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا خیر و شر دونوں کا خالق ہے اور یہ کہ ظلم، ناانصافی
غلط بیانی وغیرہ۔ تمام قبائح یعنی بری باتیں اس کے لیے جائز ہیں
وہ جو چاہے کرے۔ اس کے لیے کوئی پابندی نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ
جب خداوند عالم کی ذات کے متعلق ہمارا نقطہ نظر اس درجہ تک
محدود رہے گا تو اس کے بعد کی منزلیں اس سے پست ہی ہوتی جائیں گی
مثل مشہور ہے "وزیرے چنین شہریارے چنان"
جب خدا اس طرح کا ہے تو اس کا رسولؐ اسی اعتبار سے ہوگا۔
اور جب رسولؐ کا درجہ یہ ہوگا تو اس کے جانشین ایسے ہی ہوں گے
اور جب پیشواؤں کا یہ عالم ہوگا تو متبعین کا پوچھنا ہی کیا؟

جب الوہیت کی منزل "جائز الخطا" ہونے کی سطح پر قائم ہوتی ہے تو نیچے کے درجوں میں "عصمت" کا خیال ہی غیر ممکن ہے۔

اس عقیدہ سے بری باتوں کی برائی بالکل ٹُھک ہو جاتی ہے اور ظلم وغیرہ کی اہمیت انسان کو محسوس نہیں ہوتی۔ ممکن ہے کہ اس عقیدہ کے رکھنے والوں میں بھی ایسے افراد ہوں اور واقعی ہوتے ہیں کہ جو اپنے اخلاق کے لحاظ سے شائستہ انسان کہے جا سکیں، مگر یہ اُن کے حسن فطرت کا نتیجہ ہے، اُن کے مذہبی عقیدہ کا ہرگز یہ تقاضا نہیں ہے۔ اس کے برخلاف مذہب حق کی تعلیم یہ ہے کہ خدا کی ذات تمام برائیوں سے منزہ و مبرا ہے۔ وہ عادل ہے اور حکیم ہے، اُس کا ہر فعل خیر ہی ہے اور شر کا اُس کے یہاں گزر نہیں ہے۔ قرآن مجید نے خداوند عالم کے اوصاف کے تذکرہ میں بہت اس عملی پہلو پر توجہ کی ہے۔ ان اللہ لا یحب الظالمین۔ ان اللہ لا یحب المفسدین وغیرہ وغیرہ

پھر جب وہ دوسروں سے ظلم اور فساد وغیرہ کو پسند نہیں کرتا تو اپنی جانب سے کیونکر پسند کریگا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اُس کی قدرت محدود ہے یا وہ عاجز ہے۔ بلکہ وہ اپنے کمال ذاتی اور حکیمانہ رفعت کے لحاظ غیر ممکن ہے کہ ان باتوں کا مرتکب ہو اس سے انسان کے ذہن میں ان باتوں کی برائی اور قبیح افعال سے نفرت کا احساس راسخ ہوتا ہے

اور اُس میں طبعی طور پر ان چیزوں سے علیحدگی کا خیال پیدا ہوتا ہے

جبر و اختیار

ایک فریق کا عقیدہ ہے کہ انسان جو کچھ کام کرتا ہے وہ خدا کی جانب سے ہے، انسان نماز پڑھتا ہے تو وہ نہیں پڑھتا بلکہ خدا پڑھواتا ہے اور یہ شراب پیتا ہے تو خود سے نہیں پیتا بلکہ خدا پلواتا ہے انسان مثل ایک بیجان آلہ کے خدا کے ہاتھ میں متحرک ہے اور یہ کوئی بات اپنی طرف سے نہیں کرتا۔

یہ عقیدہ اگر دنیا کے دماغ پر پورا اثر کرے تو دنیا میں کوئی مجرم اپنے جرم کے بعد خجالت محسوس ہی نہ کرے اور نہ کوئی گنہگار اعتراف گناہ کرے، اصلاح کے دروازے بند ہو جائیں اور تعلیم و تربیت بیکار قرار پائے۔ اس لیے کہ دنیا میں جو کچھ افعال ہوتے ہیں وہ انسان کی جانب سے نہیں بلکہ خدا کی طرف سے ہوتے ہیں بلکہ اس لحاظ سے ایک گنہگار اور مجرم انسان عزت کا مستحق ہے کہ وہ منشاء الہٰی کی تکمیل کا ذریعہ اور مشیت خداوندی کا عملی مظہر ہے۔

کیا اس طرح نظام زندگی کی عملی اصلاحات ہو سکتی ہے اور افراد انسانی کے اخلاق کی تکمیل ممکن ہے۔

ایمۂ معصومین کی تعلیم اور مذہب کا صحیح عقیدہ یہ ہے کہ انسان اپنے افعال کا ذمّہ دار ہے، اچھے کام بھی وہی کرتا ہے۔ اور بُرے کام بھی وہ اپنے اختیار سے کرتا ہے۔

بے شک اچھے کاموں میں خدا کی طرف سے امداد ہوتی ہے جس کا نام ہے توفیق مگر اس کی وجہ وہ فعل انسان کے حد اختیار سے خارج نہین ہوتا۔ اور بُرے کاموں کے لیے اکثر خارجی تحریکات اور شیطان کے وسوسے محرک ہوتے ہیں مگر پھر بھی انسان بے بس نہیں ہوتا۔ اور جزا و سزا سب انسان کے ذاتی افعال کا نتیجہ ہے اور اس لحاظ سے ہر انسان کو اپنے اصلاح عمل کا موقع حاصل ہے اور اُس کا فرض ہے کہ وہ گنہ سے اجتناب کرے اور اچھے اعمال کی پابندی اختیار کرے ایسا نہ کرنے کی صورت میں مجرم وہی ہوگا اور اُس کی ذمہ داری کسی دوسرے پر عائد نہ ہوگی۔

بداء

یہود کا عقیدہ تھا کہ خدا جو کچھ مقرر کرنا تھا ازل میں مقرر کر چکا اب وہ کوئی تبدیلی نہین کر سکتا، قرآن مجید میں اس عقیدہ کا ان الفاظ میں تذکرہ کیا گیا ہے اور اُس کی رد کی گئی ہے کہ قالوا ید اللہ مغلولۃ

غلت ایدیھم ولعنوا بما قالوا بل یداہ مبسوطتان ینفق کیف
یشاء" یہ کہتے ہیں کہ خدا کے ہاتھ بندھ گئے ہیں۔ خود ان کے ہاتھ بندھے
ہوئے ہوں گے اور یہ مستحق لعنت ہیں اپنے اس قول کی وجہ سے بلکہ اُس
کے ہاتھ کھُلے ہوئے ہیں وہ جس طرح چاہتا ہے عطا فرماتا ہے"
بدقسمتی سے مسلمانوں کے ایک بڑے حلقہ میں بھی یہ خیال پیدا ہو گیا
کہ خدا کے مقررہ فیصلوں میں تبدیلی ناممکن ہے وہ کہتے ہیں کہ فیصلہ کا
تبدیل کرنا پشیمانی کا نتیجہ ہوتا ہے اور پشیمان وہی ہوتا ہے کہ جو نتائج سے
بے خبر ہو۔ خدا کے فیصلوں میں تبدیلی کا قائل ہونا اُس کے وسعتِ علم
کا انکار کرنا اور اُس کو انجام سے ناواقف قرار دینا ہے اس لیے
درست نہیں۔ شیعہ فرقہ کے عقیدہ میں خداوند عالم کے احکام مصالح
و اسباب کے لحاظ سے ہوتے ہیں اس لیے صورت حال اور اسباب
کی تبدیلی کے ساتھ اُن احکام میں بھی تبدیلی ہونا چاہیئے اسی کا نام
بداء ہے۔ یہ کہنا کہ فیصلہ کی تبدیلی ہمیشہ پشیمانی اور ناعاقبت اندیشی
ہی کا نتیجہ ہے۔ درست نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ہو سکتا ہے کہ قرارداد
کسی وقتی مصلحت پر مبنی ہو اگرچہ فیصلہ کرنے والے کو پہلے سے یہ
علم ہو کہ آئندہ اس طرح سے تبدیلی واقع ہو گی اس کی مثال یہ
ہے کہ آپ کے یہاں ملازم کی تنخواہ کی ایک شرح مقرر ہے اور

وہ سات روپیہ ماہوار ایک نیا ملازم آپ کے یہاں آتا ہے ممکن ہے
آپ جانتے ہوں کہ یہ اتنا وفادار اتنا ہنرمند اور باسلیقہ ہے
کہ اس کے خدمات کے صلے میں مجھ کو بعد میں ایک روپیہ ماہوار
کا اضافہ اس کی تنخواہ میں کرنا پڑے گا مگر اس وقت ایسی کوئی وجہ
نہیں پائی جاتی جس کی بنا پر اپنے عام اصول کو توڑ دیں لہذا آپ
خود اس ملازم کو بھی یہی بتلائیں گے کہ تمھاری تنخواہ سات روپیہ
ماہوار ہے اور دوسرے لوگوں سے بھی یہی کہیں گے اور رجسٹر پر بھی
یہی درج کریں گے۔ بے شک جب وہ کوئی ایسی خدمت کرے گا
یا کوئی خاص وفاداری کا ثبوت پیش کریگا تو آپ اُس کی تنخواہ
میں اضافہ کردیں گے اُس وقت خود اُس سے بھی کہیں گے کہ تمھاری
تنخواہ بڑھادی گئی اور اپنے رجسٹر کی بھی تبدیلی کرینگے مگر کیا اس کی
وجہ سے آپ کی عاقبت اندیشی اور انجام بینی پر اثر پڑتا ہے ہرگز نہیں
یوں ہی سمجھ لیجیے۔ خداوند عالم کی قراردادیں مصالح و حکم پر
مبنی ہوتی ہیں وہ قیامت تک کی تبدیل ہونے والی تمام صورتوں کو
ہمیشہ سے جانتا ہے مگر کسی خاص سبب کے ظہور پذیر ہونے کے پہلے
اُس کے مطابق قرار دینا حکمت و مصلحت کے خلاف ہے لہذا جیسا وقت
ہوگا ویسی بات ہوگی۔ قرارداد فعل ہے اور علم صفت، فعل تبدیل

ہوتا ہے مگر علم ازلی ہے اُس میں تبدیلی ہرگز نہیں ہے۔

اب دیکھیے کہ اس عقیدہ کا انسان کے عمل پر کیا اثر پڑتا ہے ظاہر ہے کہ بیشتر افراد بشر خود غرض ہوتے ہیں یعنی اپنا کوئی فائدہ چاہتے ہیں اور ایسے بلند نظر اشخاص کم ہوتے ہیں جو صرف "مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ" کے اصول پر اعمال بجالائیں۔ اگر انسان یہ سمجھے کہ جو کچھ وہ کرتا ہے اُس کا کوئی نتیجہ نہیں ہے بہر حال خدا کے جو فیصلے ازل میں ہو چکے ہیں وہ ہو کر رہیں گے تو انسان جدو جہد، کوشش عمل کو بیکار سمجھے گا اور محنت و مشقت کا کوئی فائدہ محسوس کریگا کیونکہ جو کچھ ہونے والا ہے بہر حال ہو گا۔ اس کے کیے سے کچھ نہ ہوگا لیکن اگر انسان یہ سمجھے گا کہ ہمارے افعال و اعمال سے تقدیر بھی بدل جاتی ہے اور خدا کے فیصلے بھی ہمارے حالات کے لحاظ سے تبدیل ہوتے ہیں تو اُسے احساس پیدا ہوگا کہ ہم اپنے عمل کی کیفیت کو بہتر سے بہتر بنائیں تاکہ ہمیں بہتر نتیجہ حاصل ہو سکے۔

خداوند عالم اپنے بندوں کے لحاظ سے صرف ایک حاکم اور فرمانروا کی حیثیت نہیں رکھتا جس کو زبردستی اپنے حکم کے منوانے سے غرض ہو بلکہ وہ اس کے ساتھ ایک خیر خواہ ناصح اور مشیر کی حیثیت بھی رکھتا ہے اس لیے وہ اپنے احکام میں ایک طرف آمرانہ حیثیت سے

آخرت کے انعام اور مخالفت پر سزائے اخروی کا پیغام دیتا ہے اور دوسری طرف وہ اُن افعال و اعمال کی افادی حیثیت کو ظاہر کرتے ہوئے اُن کے دنیوی فوائد یا خواص سے بھی مطلع کرتا ہے۔

صدقہ ردِّ بلا کا باعث ہے غریبوں کی خبرگیری کرنا عمر میں اضافہ کا سبب ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ انسان کے لیے ایک بہترین عمل کا محرک ہے۔

فرض کیجیے وہ حضرت عیسیٰ کا مشہور واقعہ کہ آپ نے ایک عروس کے متعلق حکم لگایا تھا کہ اس کا کل انتقال ہو جائے گا اور دوسرے دن ایسا نہیں ہوا اور تحقیق پر یہ معلوم ہوا کہ اس نے ایک بھوکے کو سیر کر دیا تھا اس لیے بلا رد ہو گئی اور عمر میں اس کی وسعت ہو گئی یہ واقعہ آپ کے سامنے ہوا ہوتا تو کیا اسی طرح آپ سائلوں کو رد کر دیا کرتے اور غریبوں کی طرف سے منھ پھیر لیا کرتے جیسا اب کرتے ہیں۔

قرآن مجید اور اس کے آیات کو تدبر کی نگاہ سے دیکھیے اور تعلیمات مذہبی پر غور کیجیے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ مذہب کے مسلّمہ عقائد و تعلیمات میں بہت سی باتیں وہ ہیں جن کی حقیقی بنیاد یہی چیز ہے کہ خدا کے فیصلے اسباب و مصالح کے لحاظ سے بدلتے ہیں

اور یہی وہ ہے جس کا نام ہے بداء جس کو ہمارے لیئے سرمایۂ طعن تشنیع قرار دیا جاتا ہے ملاحظہ ہوں ذیل کے امور۔

(۱) مغفرت خدا گناہوں کو بخشتا ہے۔ تمام مسلمانوں کا عقیدہ ہے دریافت طلب یہ ہے کہ جس وقت گناہ کیا اُس وقت یہ شخص مستحق عذاب بنا یا نہیں۔ اگر نہین تو بخشش کے کوئی معنی نہیں اور اگر بن گیا تو مغفرت کے بعد وہ حکم بدلا یا نہین۔ اگر نہیں تو بخشش کوئی چیز نہین اور اگر بدلا تو یہی وہ ہے کہ جس کا انکار کیا جا رہا تھا اس عنوان کے تحت میں تمام وہ کثیر التعداد آیات قرآنی پیش کیے جا سکتے ہیں جن میں مغفرت کا تذکرہ ہے۔

(۲) توبہ بندوں کی توبہ جو سچے دل سے ہو قبول ہوتی ہے یہ مسلمانوں کا متفقہ عقیدہ ہے۔ اس کے معنی یہی ہیں کہ انسان گناہ کرنے کے بعد عذاب خدا کا مستوجب بن گیا تھا اور توبہ کی وجہ سے کہ جو انسان کا فعل ہے اُس قرارداد میں تبدیلی ہو گئی اُس وقت یہ اہل نار سے تھا اور اب یہ اہل جنت سے ہے۔

کیا یہ وہی چیز نہین ہے جسے بداء کہکر مورد اعتراض قرار دیا جاتا ہے،

(۳) شفاعت انبیا اور معصومین بلکہ عام مومنین اور بالخصوص حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیلیے

شفاعت کا درجہ تمام مسلمانوں کے نزدیک ثابت ہے۔ یعنی آپ کی سفارش بہت سے گناہ گاروں کی مغفرت کا سبب ہوگی۔ اب بتایئے کہ اس سفارش کے پہلے یہ اشخاص جہنم میں جانے والے تھے یا نہیں، اگر نہیں تو سفارش کی ضرورت نہیں اور اگر تھے تو شفاعت سے فیصلہ بدلا یا نہیں۔

(۴) دعا: قرآن مجید میں دعا کا حکم موجود ہے اور اس کی قبولیت کا وعدہ کیا گیا ہے جمہور مسلمین کا عقیدہ بھی اس کے مطابق ہے مگر کیا اس خیال کے مطابق کہ جو کچھ فیصلہ ہونا تھا ہو چکا۔ اور وہ قابل تبدیلی نہیں ہے۔ دعا کا کوئی نتیجہ قرار پاتا ہے اور قبولیت دعا کے کوئی معنی ہو سکتے ہیں۔

دعا اور اس کی قبولیت سے صاف ظاہر ہے کہ انسانی افعال کے لحاظ سے مقررہ باتوں میں تبدیلی ہو سکتی ہے اور اسی کا نام بدا ہے

اس کے علاوہ اگر غور کیا جائے تو کفر کے بعد ایمان لانے سے نجات کا حکم بالکل اسی بنیاد پر مبنی ہے۔

ایک شخص پہلے کافر تھا، اس کے متعلق حالت کفر میں خداوندی فیصلہ کیا ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ وہ مخلد فی النار ہے یعنی ہمیشہ جہنم میں رہے گا! آپ کسی نبی و رسولؐ سے پوچھئے تو وہ اس کے

متعلق یہی حکم لگائے گا اس لیے کہ اُس کے کافر ہونے کا تقاضا یہی
ہے اس کے بعد وہ ایمان لے آتا ہے اور کلمہ لا الہ الا اللہ زبان
پر جاری کر کے دل سے مسلمان ہو جاتا ہے۔ بتائیے اب اس کا کیا حکم
ہے؟ یہ کہ جنت کا مستحق ہے اور اگر ابھی دنیا سے سدھار جائے
تو بلا حساب داخل بہشت ہوگا۔ دیکھیے انسانی طرز عمل اور حالات
کی تبدیلی سے فیصلہ میں کتنی بڑی تبدیلی ہو گئی۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو قرآن شروع سے لے کر آخر تک
عقیدۂ بدا کی تلقین کرتا ہے کیونکہ وہ کافروں کو ایمان لانے کی
دعوت دیتا ہے اور اس پر نجات کا وعدہ کرتا ہے اور یہ کہتا ہے
کہ ایسا نہ کرو گے تو تم جہنم میں جاؤ گے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ
وہ خداوندی فیصلوں کو انسانی اعمال کے ساتھ وابستہ بناتا
ہے اور انسان کے حالات کی تبدیلی سے اُنھیں قابل تبدیلی قرار
دیتا ہے۔ اور افراد انسانی کے اعمال وافعال کی اصلاح اس عقیدہ
سے وابستہ ہے۔

بھلا اگر ابوجہل کو معلوم ہو جائے کہ میں لاکھ مسلمان ہوں مگر
جو میرے متعلق فیصلہ ہو چکا وہ برقرار رہے گا تو اُسے اسلام
لانے کی ضرورت کیا ہے اور اگر ایک گنہگار انسان یہ سمجھ لے

کہ اب لاکھ میں اچھے اعمال بجالاؤں مگر میری نسبت جو فیصلہ ہو گیا ہے وہ تبدیل نہیں ہوسکتا تو اُسے کیا ضرورت ہے کہ وہ اپنی خواہش نفس کے برخلاف اچھے اعمال کا پابند بنے۔ انسانی افعال کی اصلاح موقوف ہے اس عقیدہ پر کہ خدا کے فیصلوں میں انسان کے مختلف حالات کے لحاظ سے تبدیلی ممکن ہے۔

میں نے جو چند سرخیاں قائم کردی ہیں اُن کے تحت میں آیات قرآن کی کثیر التعداد صفیں قائم ہوسکتی ہیں اور اس کے علاوہ بہت سی خصوصی آیات ہیں جو بدا کے مسئلہ کو قطعی طور پر ثابت کرتے ہیں۔ چونکہ میں نے اس موضوع پر اب تک کبھی قلم نہیں اُٹھایا تھا اس لیئے یہاں میں نے ذرا تفصیل سے کام لیا اور اگر موقع ملا تو آئندہ ایک کتاب لکھنے کے لیئے یادداشت قلم بند کردی آئندہ میں اگر نہ بھی لکھ سکوں تو اسی مختصر تبصرہ کو سامنے رکھ کر کسی دوسرے صاحب قلم کے لیئے مبسوط کتاب کی تصنیف کرلینا بالکل آسان ہے۔

نبوّت

الہیات کے بعد نبوت کا درجہ ہے، پیغمبر کی ضرورت کے

باب میں ارباب مذاہب میں کوئی اختلاف نہیں ہے بے شک نبی کے اوصاف کے متعلق زاویۂ نگاہ مختلف ہوگیا ہے۔

بہت سے لوگ انبیاء کے لئے عصمت کو ضروری نہیں سمجھتے اور کسی نہ کسی حد تک گناہ کی اجازت دیتے ہیں خواہ یہ کہ وہ گناہِ کبیرہ سے معصوم ہوتے ہون مگر صغیرہ گناہون کا ارتکاب کر سکتے ہیں، خواہ یہ کہ بعد بعثت معصوم ہیں مگر قبل بعثت گنہگار ہونا ممکن ہے، خواہ یہ کہ جان بوجھ کر گناہ نہین کرتے مگر غلطی یا سہو و نسیان سے ارتکاب ممکن ہے۔ فرقہ شیعہ کا یہ عقیدہ ہے کہ انبیاء تمام گناہون سے ہر حال میں معصوم ہیں۔

عقلی استدلال کے لحاظ سے یہ مسئلہ بالکل صاف ہے۔ انبیاء آتے ہیں ہدایت خلق کے لیے لہذا اُن کے ہاتھوں کسی طرح گمراہی خلق کا اندیشہ نہ ہونا چاہیئے اور اگر نبیؑ کسی طرح بھی غلطی کا مرتکب ہو تو اُس سے کسی نہ کسی حد تک خلق خدا کے گمراہ ہونے اور غلط فہمی میں مبتلا ہونے کا ضرور امکان ہے۔

اب دیکھیئے کہ انسان کی عملی زندگی پر اس مسئلہ کا کیا اثر پڑتا ہے؟ یہ بالکل صاف ہے۔ اگر یہ خیال قائم کر لیا جائے کہ انبیاء بھی گناہوں کے مرتکب ہوتے تھے تو عام افراد کی نظر میں گناہ

کے ارتکاب کی کوئی اہمیت نہین باقی رہے گی بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہون کہ یہ عقیدہ دنیا کو ارتکاب گناہ کی دعوت دیتا ہے کیونکہ ہر شخص سمجھے گا کہ جب انبیار ایسے بلند افراد ایسے افعال کا ارتکاب کر سکتے ہیں تو ہمارے لیے ان کا ارتکاب کیا قابل الزام ہو سکتا ہے

اس کے خلاف یہی عقیدہ کہ انبیار کا دامن گنا ہون سے بالکل بری ہے خلق خدا کی اصلاح اور عملی تکمیل کا باعث اور اُس کا ذمہ دار ہو سکتا ہے۔

امامت

رسول کے بعد ہدایت خلق اور فرائض دینیہ کے قیام کے لیے ایک حاکم و فرمانروا کی ضرورت ہے۔ مسلمانوں میں سے ایک طبقہ کا خیال ہے کہ اس کے انتخاب کا حق جمہور اُمت کو ہونا چاہیئے۔

وہ کہتے ہیں کہ امامت کو بطور نامزدگی رسول کی جانب سے قرار دیا جانا اور یکے بعد دیگرے امامون کا سلسلہ ہونا اصول جمہوریت کے خلاف ہے مگر یہ خیال بالکل غلط ہے۔ جمہوریت کا اصُول تو اُسی وقت شکستہ ہو گیا جب نبی کا انتخاب ہمارے قبضہ میں

نہیں ہوا اور جبکہ نبی کی نبوت کو ہم خدا کی طرف سے تسلیم کر چکے تو اب اگر نبی اپنے اختیارات کی بنا پر کسی کو اپنا جانشین مقرر کرے تو کسی دوسرے کو اس میں چون و چرا کا یا اس کے خلاف اپنے حق انتخاب کے پیش کرنے کا کیا حق ہے۔

چونکہ ہمارے افراد جذبات کے پابند ہوتے ہیں اور ہر چیز میں خودغرضی اور مطلب براری اُن کے پیش نظر رہتی ہے اس لیے ان کا انتخاب بالکل بے لوث اور غیر جانبدارانہ نہیں سمجھا جا سکتا اور اس میں غلطی کا بھی امکان ہے لہذا ضرورت ہی کہ ہادی خلق کو خدا اپنی جانب سے معین کرے اور جس طرح نبی اُس کی طرف سے مبعوث ہوتا ہے اُسی طرح نبی کا جانشین بھی اُسی کی طرف سے ہو۔

وہ کہ جو امام کے انتخاب کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں وہ اس کے لیے معصوم ہونا ضروری نہیں سمجھتے کیونکہ عام افراد کی نگاہ عصمت تک جا ہی نہیں سکتی۔

مگر جبکہ امام کا تقرر خدا کی طرف سے ہے تو اُسے معصوم ہونا بھی ضروری ہے ورنہ اُس کے ہاتھوں خلق خدا کی گمراہی کا احتمال ہوگا اور اس کی ذمہ داری خدا پر عائد ہوگی۔

اس کا عملی نتیجہ وہی ہے کہ جو ہم نے عصمت انبیاء میں اس کے

پہلے ذکر کیا ہے یعنی جب امام، پیشوا اور رہنما گناہوں کا مرتکب ہے تو عام افراد کی نگاہ میں گناہ سے کوئی خوف باقی نہیں رہے گا بلکہ ان کو ارتکاب گناہ کی ایک سند ہاتھ آئے گی۔ افراد بشر کو گناہوں سے علیحدہ رکھنے کے لیے یہی عقیدہ زیادہ فائدہ رساں ہے کہ ائمہ گناہوں سے علیحدہ اور معصوم ہوتے ہیں۔

تولّا و تبرّا

یہ عقیدۂ امامت کا ایک ضمیمہ ہے۔ شیعوں کا عقیدہ ہے کہ جو اہل فضیلت اور سچے رہنما ہیں ان کے ساتھ موالات اور جو غلط دعویدار یا جھوٹے رہنما ہوں ان سے علیحدگی، بیزاری اور بے تعلقی لازم ہے۔ پہلے کا نام ہے تولا دوسرے کا نام ہے تبرا ان دونوں کا تعلق ہے عقیدۂ و عمل سے۔ جن کا تعلق روح اور جسم دونوں کے ساتھ ہے۔ رہ گیا زبان سے اس کا اظہار تو وہ اعتقاد اور ضمیر کے اقرار کا لازمی نتیجہ ہے جبکہ حالات سازگار رہوں اور دل کی بات کو دل میں مخفی رکھنے کا کوئی مخصوص سبب نہ ہو۔ اظہار حق بہرحال انسان کا فطری حق ہے بے شک اجتماعی و تمدنی مصالح کے لحاظ سے خود انسان کو اپنی نگرانی کرنا ضروری ہے

اچھے کو اچھا اور برے کو برا کہنا "فطرت آزاد" کا ایک طبعی تقاضا ہے جس سے انکار کرنا فطرت سے جنگ کا مرادف ہے مگر وہ لوگ کہ جو اپنی طرف کسی نشیب کا احساس کرتے ہیں اس کے شدت کے ساتھ مخالف ہیں وہ کہتے ہیں کہ اچھے کو اچھا تو کہو مگر برے کو برا ہرگز نہ کہو۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے جو ملت اسلامیہ کے ایک بالغ نظر عالم اور بڑے سیاسی رہنما ہیں اپنے ایک مضمون میں اس موضوع پر بہت واضح تبصرہ کیا ہے جو امامیہ مشن کی جانب سے "خلافت و امامت" حصہ پنجم کے ساتھ بطور ضمیمہ شایع کیا گیا ہے آپ کو اس سے تولا و تبرا کا عملی نتیجہ بھی معلوم ہو جائے گا "حقیقتہ برائیوں سے نفرت مکمل نہیں ہوتی جب تک برے افراد کو انسان برا نہ سمجھے اور علیٰحدگی کا ان سے احساس قائم نہ رکھے اور برے افراد سے بے تعلقی کا مظاہرہ انسان کی ذہنیت میں برائیوں سے علیٰحدگی اور بے تعلقی کا جذبہ اس طرح راسخ کر دے سکتا ہے کہ جس کے بعد انسان خود اپنے اعمال سے ان چیزوں کا ہرگز مرتکب نہ ہو۔

معاد

جزا و سزا کے لیے اس زندگی کے بعد ایک دوسرا دور مقرر

ہے، جہاں نیک اور بد اعمال کا اچھا اور بُرا بدلا دیا جائے گا
یہ تمام مُسلمانوں کا متفقہ عقیدہ ہے مگر آریہ لوگ جزا و سزا
کے لیے ایک دوسری صورت تجویز کرتے ہیں جس کا نام ہے "تناسخ"
اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی روح ایک جنم میں جو نیک اعمال
یا بد اعمال کرتی ہے ان کا بدلا دوسرے جنم میں دیدیا جاتا ہے
خواہ دوسرے انسان کے قالب میں یا جانور، درخت یا پتھر کی شکل
میں، اُن کا خیال ہے کہ روح اور مادّہ دونوں قدیم ہیں اور
روح برابر مختلف جسموں میں چکّر لگاتی رہتی ہے اور یہ "آواگون"
کا چرخا برابر چلتا رہتا ہے اور کبھی ختم ہونے والا نہیں۔

یہ مذہب عقلی حیثیت سے بالکل غلط ہے۔

جزا و سزا کا اصلی راز حقیقتہً اس کا احساس راحت یا الم میں
مضمر ہے جو انسان کو حاصل ہوتی ہے اور جس کا تعلق شعور و
ادراک سے ہے اور وہ اس تناسخ کی صورت میں بالکل مفقود ہے
کیونکہ جب کوئی روح نئے جنم میں آتی ہے تو اُسے کوئی احساس
نہین ہوتا کہ اُس کے پہلے جنم میں کیا کیا تھا۔ اور اُس کا کیا بدلا
ہو رہا ہے۔

اس کے علاوہ اگر اس کو نیا جنم جانور یا درخت یا پتھر کا حاصل

ہوا تو چونکہ اس عالم میں عقل وشعور ہی مفقود ہوتا ہے اس لیئے
اب اس کے اعمال ایسے نہیں سمجھے جاسکتے جو جزا وسزا کا تقاضا
رکھتے ہوں لہذا کوئی وجہ نہیں کہ یہ روح پھر کسی دوسرے
قالب میں جائے اور اگر وہاں جائے تو اُسے نہ کوئی راحت
ہونا چاہیئے نہ کوئی تکلیف۔ حالانکہ اُن کے خیال میں روح کا
سلسلہ تناسخ کبھی ختم نہیں ہوتا اور سعادت و شقاوت یعنی
راحت وتکلیف سے دنیا کا کوئی ذی روح بالکل خالی نہیں ہے
پھر یہ دیکھیے کہ روحیں حادث نہیں، قدیم ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نئی
روحوں کی پیدا وار تو ہوگی نہیں اب غور کیجیئے کہ ازل میں سب
روحیں قالب انسانی میں تھیں یا کچھ حیوانات اور کچھ نباتات
اور کچھ جمادات کی شکل میں - اس صورت میں اول تو کوئی
باعث ہی اس کا نہیں معلوم ہوتا کہ کچھ روحوں کو حیوانات
یا نباتات یا جمادات کی شکل میں رکھا جائے حالانکہ یہ بداعمالیوں
کا نتیجہ ہوتا ہے اور بداعمالیاں حادث چیز ہیں جو بعد کو ہوسکتی
ہیں اس کے علاوہ یہ دیکھنا چاہیئے کہ یہ روحیں جو قالب انسانی
میں ہیں یہ بھی مختلف طرح کے اعمال کریں گی جن میں سے بعض
حیوانات کے قالب میں جائیں گی ، بعض نباتات اور بعض جمادات کے

اور پھر وہ کہ جو انسان کی شکل میں آئیں گی ان میں بھی یہ تفریق قائم رہے گی اس کا نتیجہ یہ ہے کہ افراد انسانی کی مردم شماری میں برابر کمی ہوتی رہے اور یہ تعداد برابر گھٹتی رہی حالانکہ مشاہدہ اس کے خلاف شاہد ہے اگر یہ کہا جائے کہ حیوان اور نبات اور جماد کے دور سے گزر کے اور سزا حاصل کر کے پھر جو پاک ہوتی ہیں اور انسانوں کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں تو یہ افراد انسانی جو اس دور کو ختم کر کے آنے والی روحوں کے حامل ہیں ان کو نہ رنج ہونا چاہیئے، نہ کوئی راحت نہ کوئی مسرت انھیں حاصل ہونا چاہیئے، نہ کوئی تکلیف - یہ بھی بالکل مشاہدہ کے خلاف ہے دنیا کی کوئی فرد ان حالات سے ہرگز خالی نہیں ہے -

بہت سے وہ بچے ہیں جو پیدا ہوتے ہی مر جاتے ہیں انھیں دنیا میں نہ چین نصیب ہوتا ہے نہ تکلیف - اس کا کچھ سبب معلوم نہیں ہوتا جبکہ روح کے نئے جسم میں لانے کا مقصد صرف جزا و سزا ہے اگر یہ کہا جائے کہ اس کا دنیا میں آ کے مر جانا ہی اس کے جزا و سزا کے لیے کافی ہے تو پھر اس کے آگے سلسلہ چلنے کا کوئی باعث نہیں جبکہ اس دور میں کچھ ایسے اعمال نہیں جس کے لیے سزا و جزا کا موقع ہو -

اس سب سے قطع نظر کر کے اس سلسلۂ لا متناہی پر ایک اصولی اعتراض ہے اور وہ یہ کہ جزا کے مفہوم میں یہ مضمر ہے کہ اس کے پہلے عمل مقدم ہو اس لیئے ایک ایسا نقطہ ماننا لازمی ہے کہ جہاں پر عمل ہو اور وہ بطور جزا نہ ہو، اس طرح یہ سلسلہ متناہی ہو جاتا ہے اور اب پہلے انسان کے متعلق یہ سوال ہو گا کہ کیا وہ دنیا میں خوشی اور رنج دونوں سے خالی رہا ہو گا حالانکہ یہ بالکل فطرت کے آئین کے خلاف ہے۔

آریوں کی طرف سے تناسخ کے ثبوت میں اُن آیات قرآنی کو پیش کیا جاتا ہے جن میں بعض امم سابقہ کے مسخ ہونے کا تذکرہ ہے حالانکہ مسخ اس تناسخ سے بالکل مختلف چیز ہے وہاں روح اُس جسد کو چھوڑتی نہیں بلکہ اُسی جسم کی شکل میں تبدیلی ہو جاتی ہے اور تناسخ میں وہ پہلا شخص مر جاتا ہے اُس کی لاش بے جان ہوتی ہے اور یہ روح یہاں سے نکل کر کسی اور شکم مادر سے عنقریب متولد ہونے والے بچہ کے اندر پہونچتی ہے اور اُس کے ساتھ متولد ہوتی ہے۔ بھلا اُس کو اس سے کیا تعلق پھر یہ کہ مسخ صرف بعض امم کے لیے بطور دنیوی عقوبت کے بیان کیا گیا ہے اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ عام نظام جزا و سزا کا یہی ہے

اور اس کے علاوہ روز آخرت کوئی چیز ہی نہیں ہے۔

عقیدۂ تناسخ کے لحاظ سے انسانوں کے افعال اور اُن کی زندگی کی نوعیت اُن کی اختیاری نہیں ہے کیونکہ سابقہ دور میں جیسے اعمال کیئے ہوں گے اُس طرح کی زندگی اُنھیں نصیب ہوگی۔ ایک ڈاکو ہے تو وہ اس ڈکیتی پر مجبور ہے کیونکہ یہ نتیجہ ہے اُس کے پہلے جنم کے اعمال کا اور وہ اس کے قدرت و اختیار کے حدود سے اب باہر ہیں۔ انسان کا ہر حال ماضی کے ساتھ وابستہ ہے اور ماضی اختیار سے باہر۔ اس لیئے انسان کا کوئی دور اس کا اختیاری نہیں قرار پاتا اور اس طرح جزاو سزا کا سوال ہی ختم ہو جاتا ہے۔

بہر حال اب دیکھیئے کہ اخلاق و اعمال کی اصلاح کے لیے جزاو سزا کا کون سا عقیدہ زیادہ کارگر اور مفید ہے۔

معلوم ہونا چاہیئے کہ انسان حقیقتہً جو ڈرتا ہے وہ اپنی تکلیف اور نفس کی اذیت سے، کیسی ہی حالت ہو مگر وہ یہ سمجھ لے کہ اس میں کوئی ایذا نہیں ہے تو وہ ہرگز اس سے کوئی خوف نہ کرے گا انسان کا آئندہ جنم میں کسی شکل میں منتقل ہو جانا افراد انسانی کو دہشت زدہ اور متاثر نہیں کرے گا کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ جس جنم میں وہ ظاہر ہوں گے اُن کی فطرت و طبیعت اُسی جنم

کے مطابق ہوگی اور انھیں ہرگز اُس میں کسی الم نفسانی اور تکلیف کا احساس نہ ہوگا۔

دیوانہ ہوجانا ایک انسان کے لیے کتنا ہی قابل افسوس ہو مگر یہ افسوس دوسرے کرتے ہیں، وہ ہرگز اُس پر متاسف نہیں ہے بلکہ ممکن ہے کہ اس میں ایک کیف اور لذت محسوس کرتا ہو۔

"دیوانہ باش تا غم تو دیگران خورند"

اور پھر اگر سزا کی نوعیت اس انسان کی افتاد طبع کے مطابق بھی ہو۔ مثلاً غلہ کے چور کو چوہے کی شکل یا پانی کے چور کو مینڈک کی شکل، اور کسی بڑے مقدس انسان کے قاتل کو گائے کی شکل حالانکہ اس ذریعہ سے وہ خود ایک بڑے طبقہ کے نزدیک مقدس اور قابل تعظیم ہوگیا۔

ہرگز اس طرح کی سزا کا خیال وہ نہیں ہے کہ جو انسان کے دل و دماغ پر اثر کرے اور اُس کو اپنے اعمال کی نگہداشت پر مجبور کرے برخلاف جزا و سزا کی اُن تصویروں کے جو اسلام نے پیش کی ہیں جن میں زیادہ نمایاں احساس راحت اور وجدان تکلیف و الم کا ہے۔

پڑھیے قرآن کی یہ آئیں۔

لھم فیھا زفیر وشھیق ـــ
یقول الکافرون ھذا یوم عسر ـــــ یوم یعض الظالم علیٰ یدیہ اور کفار کی تمنائیں اور حسرتیں ۔ یاحسرتیٰ علیٰ ما فرطت فی جنب اللہ ۔ رب ارجعون لعلی اعمل صالحا فیما ترکت وغیرہ اس سے براہ راست شعور واحساس کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ وہ ہے کہ جو دلون کو اس عذاب کی اہمیت سے متاثر کرتا اور اصلاح اعمال کی فکر دامنگیر کرتا ہے ۔
بے شک اسلامی عقیدہ میں بھی اس دنیا کی جزا وسزا کا پتہ ملتا ہے مگر وہ ہر شخص کو خود اس جنم میں کہ جس میں اُس نے اعمال کیئے ہیں ۔ ممکن ہے کہ اُس کو بعض نعمتیں عطا ہون ۔ اُس کی کسی نیک عمل کی جزا میں یا کوئی مصیبت ڈالی جائے اُس کے کسی بُرے عمل کی سزا میں ۔ مگر اس سے روز آخرت کی ضرورت اور اُس کی اہمیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور خود یہ خیال کہ ہمیں ہمارے اعمال کا پھل اس دنیا میں بھی مل سکتا ہے دنیا کو اصلاح عمل کی دعوت دینے کا ایک ذریعہ ہے جس طرح یہ آیت کہ ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم جس کا مفاد یہ ہے کہ خدا کے انعام وعطا کی تبدیلی اُن کے

نفسانی حالات کی تبدیلی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ انسان کے لیے اصلاح نفس اور اُس کے اعمال کا جائزہ لینے کی ایک بہترین تحریک ہے۔

گزشتہ بیانات کا نتیجہ

مذکورۂ بالا بیانات سے صاف معلوم ہوا کہ وہی عقائد حقہ جن کی اسلام نے تعلیم دی ہے انسانی افعال و اعمال کی اصلاح کا بہترین ذریعہ ہو سکتے ہیں۔

اب اگر ہم دیکھیں کہ ہمارے مذہبی افراد اپنے افعال و اخلاق کے لحاظ سے دوسری قوموں سے کوئی امتیاز نہیں رکھتے بلکہ اکثر حیثیتوں سے پستی میں ہیں تو ہمیں سمجھنا چاہیے کہ یہ عقائد حقیقتہً ہمارے دلوں میں راسخ ہی نہیں ہوئے ہیں اور اُن کا پورا اثر ہمارے دماغوں پر قائم نہیں ہوا ہے۔

ہم کو کوشش کرنا چاہیے کہ جن عقائد کی ہم زبان سے تبلیغ کرتے ہیں ہمارے افعال و اعمال بھی ان ہی کی ترجمانی کریں جب ہی ہم صحیح طریقہ سے ان عقائد کے معتقد سمجھے جا سکتے ہیں۔

بہر حال ہم اگر اپنے بچوں کو صحیح طور پر مسلمان مومن بنانے

کا خیال رکھتے ہیں تو بچپنے ہی سے ہمیں اُن کو مذکورہ عقائد کی تعلیم دینا چاہیئے نہ صرف اس طرح کہ اُنھیں دینیات کی کتابون کے الفاظ رٹوا دیئے جائین بلکہ اس طرح کہ وہ عقائد اُن کے ذہن نشین ہو جائیں اور وہ اُنھیں سمجھ لیں اور یقین کر لیں یہاں تک کہ اُن کی کالج اور اسکول کی زندگی میں اُن کے ان عقائد پر کوئی اعتراض کیا جائے تو وہ جواب نہ دے سکیں نہ سہی مگر اُنھیں اضطراب ضرور پیدا ہو کہ ہمارے مذہب پر یہ اعتراض ہوا ہے تو ہمیں اُس کا جواب دریافت کر کے پیش کرنا چاہیئے، اگر ہماری نوخیز نسل میں یہ جذبۂ تحقیق اور کاوش طلب پیدا ہو جائے تو یہی اُن کے مذہب کی حفاظت کا بہت بڑا قلعہ ہوگا کیونکہ ہمارا مذہب طاقتور ہے وہ اعتراضات و توہمات سے متزلزل نہیں ہو سکتا۔ مگر شرط یہ ہی کہ اس اعتراض کے دفعیہ کا خیال اور اس کے متعلق تحقیق اور جستجو کا جذبہ پیدا ہو۔

تمام شد

حصۂ اوّل

فہرست رسائل امامیہ مشن رجسٹرڈ لکھنؤ

نمبر شمار	نام رسالہ	قیمت	[illegible]	نمبر شمار	نام رسالہ	قیمت	[illegible]
۱	قاتلان حسینؑ کا مذہب	۴/	ـ/	۲۲	جنگ صفین	۲/	ـ/
۲	تحریف قرآن کی حقیقت تیسرا ایڈیشن	زیر طبع		۲۳	تذکرۂ حفاظ شیعہ حصہ اول	۶/	ـ/
۳	مولود کعبہ	ختم		۲۴	″ ″ دوم	۵/	ـ/
۴	وجود حجت	۴/	ـ/	۲۵	مقصود کعبہ	ـ/	ـ/
۵	اصول دین اور قرآن	۴/	ـ/	۲۶	مذہب باب و بہا حصہ دوم	۹/	ـ/
۶	اتحاد الفریقین حصہ اول	۴/	ـ/	۲۷	مذہب اور سائنس	ختم	
۷	حسین اور اسلام اردو	۱/	ـ/	۲۸	معرکۂ کربلا	″	
۸	″ ″ ہندی	ـ/	ـ/	۲۹	کربلا کا مہایودھ	″	
۹	″ ″ انگریزی	ختم		۳۰	دی ٹریجڈی آف کربلا انگریزی	″	
۱۰	متعہ اور اسلام	۹/	ـ/	۳۱	اسلام کی حکیمانہ زندگی	۹/	ـ/
۱۱	امامت ائمہ اثنا عشر اور قرآن	۰/	/	۳۲	دور استبداد	۴/	ـ/
۱۲	تجارت اور اسلام	ختم		۳۳	حقیقت بداء	۲/	ـ/
۱۳	اتحاد الفریقین حصہ دوم	″		۳۴	خطیب آل محمدؐ	۴/	ـ/
۱۴	علی اور کعبہ	″		۳۵	تدوین حدیث	ـ/	ـ/
۱۵	رجال بخاری حصہ اول	۶/	ـ/	۳۶	مطلوب کعبہ	ـ/	ـ/
۱۶	مذہب باب و بہار حصہ اول	۵/	ـ/	۳۷	محاربہ کربلا	۲/	ـ/
۱۷	نور عزا اور غدیر	ـ/	ـ/	۳۸	اسلام کا پیغام اردو	۰/	۰/
۱۸	مجاہدۂ کربلا	۲/	ـ/	۳۹	دی میسج آف اسلام انگریزی	۰/	۰/
۱۹	کربلا کا ماتم نبیان سندی	ختم		۴۰	اثبات عزاداری	۴/	ـ/
۲۰	دی مارٹیڈم آف حسین انگریزی	۲/	ـ/	۴۱	مسئلہ فدک	۵/	ـ/
۲۱	اسوۂ حسینی	۴/	ـ/	۴۲	تاجدار کعبہ	ـ/	ـ/

نمبر شمار	نام رسالہ	قیمت	خرچ ڈاک	نمبر شمار	نام رسالہ	قیمت	خرچ ڈاک
۴۳	خلافت و امامت حصہ اول	۵ر	لـر	۵۸	اسلامی عقائد	۲ر	ـ۳
۴۴	" " دوم	۴ر	لـر	۵۹	آثار باقیہ	ار	٠ر
۴۵	" " سوم	۴ر	لـر	۶۰	صحیفہ سجادیہ کی عظمت	۱۰ر	ـر
۴۶	تحقیق اذان	ار	ـر	۶۱	خلافت و امامت حصہ پنجم	۶ر	لـر
۴۷	ذوالجناح	٠ر	٠ر	۶۲	خدا کی معرفت	۸ر	ـر
۴۸	شہدائے کربلا حصہ اول	۲ر	لـر	۶۳	شہدائے کربلا حصہ سوم	۲ر	ار
۴۹	کربلا کا مہا سمر ہندی	۲ر	ـر	۶۴	خلافت و امامت حصہ ششم	۸ر	ـر
۵۰	حسینؑ اینڈ دی پلین آف کربلا انگریزی	۱۰ر	ـر	۶۵	دی لاسٹ سپیچ آف حسینؑ	۲ر	ـر
۵۱	مشہد اعظم	لـر	ـر	۶۶	آئینہ حقیقت مع نقد و تبصرہ	زیر طبع	
۵۲	لا تفسدوا فی الارض	۸ر	ـر	۶۷	شیعوں کی تازہ زندگی	ار	٠ر
۵۳	نہج البلاغہ کا استناد	۴ر	لـر	۶۸	صحیفۂ اعمال مترجم	عہ ر	ـر
۵۴	خلافت و امامت حصہ چہارم	۳ر	ار	۶۹	مذہب شیعہ اور تبلیغ	لـر	٠ر
۵۵	شہدائے کربلا حصہ دوم	۵ر	لـر	۷۰	اسیری اہل حرم	۱۰ر	٠ر
۵۶	ابو الائمہ کی تعلیمات	۴ر	ار	۷۱	دی مشن آف حسینؑ انگریزی	ار	٠ر
۵۷	حسینؑ کا پیغام عالم انسانیت کے نام	ار	٠ر	۷۲	نظام زندگی حصہ اول	۴ر	لـر

فہرست امامیہ مشن بک ایجنسی لکھنؤ

نمبر شمار	نام رسالہ	قیمت	خرچ ڈاک	نمبر شمار	نام رسالہ	قیمت	خرچ ڈاک
۱	الشہید	۱۰ر	ـر	۸	رجال بخاری حصہ دوم	۶ر	لـر
۲	کائنات قبل از اسلام	۲ر	ـر	۹	رسولؐ کی بیٹی	۲ر	ـر
۳	قاتلان حسینؑ کی گرفتاری	۸ر	۲ر	۱۰	تاریخ ازدواج	۸ر	ـر
۴	حجج و بینات	عہ ر	۲ر	۱۱	الہامی کلمات	۳ر	ار
۵	موجزۃ الاحکام	۴ر	لـر	۱۲	شہید اسلام	۶ر	۵ر
۶	صحیفہ تجلی	۸ر	لـر	۱۳	ثانی زہراؑ	عہ ر	۲ر
۷	گل عصمت	۱۰ر	ـر	۱۴	ہمارے رسولؐ	۲ر	ار
				۱۵	ہماری خاتون جنت	۲ر	ار

پبلشر سید مصطفےٰ احسن رضوی سکریٹری امامیہ مشن پرنٹر سید شوکت حسین صاحب لکھنؤ